اردو صحافت میں اظہار وابلاغ کے

مختلف پیرائے کا تنقیدی جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا یونیورسٹی، فیض آباد

مقالہ نگار

صالح عبد اللہ

سنہ ۲۰۰۰ء

نگراں

ڈاکٹر طلعت حسین نقوی

ریڈر شعبہ اردو، گنپت سہائے پی جی کالج، سلطانپور

فہرست مضامین (مطابق سیناپسس)

اردو صحافت میں اظہار و ابلاغ کے مختلف پیرائے کا تنقیدی جائزہ

مقدمہ

اس تحقیقی مقالہ میں اردو صحافت کے تقریباًڈیڑھ سو سال کی تاریخ کااس پہلو سے جائزہ لیا گیا ہے کہ مختلف ادوار میں کس طرح کے اظہار و ابلاغ کے پیرائے مروج رہے اور ان کے اندر جو تغیرات رونما ہوئے ان کے تہذیبی لسانی اور معاشرتی عوامل کیا تھے۔ مختلف اخبارات کے اقتباسات اور صحافیوں کی تحریروں کے حوالے اسلوب واظہار کے بدلتے ہوئے رجحانات کی نشاندہی کی گئی ہے اور خوشگوار تغیرات کا پتہ چلایا گیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کام کے لئے مجھے ہر دور کے اخبارات سے متعلق مواد مختلف مقامات پر آسانی سے دستیاب ہوتا رہا اور اس سے اپنے تحقیقی کام کے متعینہ منصوبہ کے مطابق استفادہ کرنے اور ضروری نتائج اخذ کرنے میں کوئی دشوری پیش نہیں آئی۔

اردو صحافت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو نثر کی۔اس کا آغاز انیسویں صدی کے نصف اول ہی سے ہوتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر ہندوستان کے مخلف گوشوں میں آباد عوام وخواص کے درمیان خیالات و نظریات،افکار و حوادث اور میلانات ورجحانات کی ترسیل وابلاغ کاایک کامیاب وسیلہ یہی ہے۔اردو نثر نے اس طویل مدت میں اردو صحافت کے ساتھ ساتھ ترقی کے مختلف مدارج طے کئے ہیں سماج میں روزمرہ ہونے والی تبدیلیوں کا عکس صحافت کے حوالے سے اردو نثر میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو نثر کے اسلوب کی بدلتی ہوئی کڑیوں کا سب سے پہلے اندازہ اردو صحافت کو ہی دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان میں اردو نثر پر رجب علی بیگ سرور کے مرصع و مسجع وفارسی آمیز اسلوب کا غلبہ تھا۔اردو کے علاوہ ہندوستان کے

خواص میں فارسی و عربی دوسری زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت اردو صحافت کی زبان بھی اس وقت کے پسندیدہ اسلوب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی لیکن میر امن اور دہلی کالج کے اردو نثر نگاروں کے اثرات اور غالب کے مکاتب کے اثرات غالب ہو رہے تھے۔ غدر کے بعد اردو نثر و نظم کی دنیا میں زبردست انقلاب آیا۔ پھر سر سید کی علی گڑھ تحریک کی بدولت اردو زبان عوامی بولی کے قریب آ گئی اور فارسی و عربی زبان کے اثرات سے آزاد ہو کر اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی فکر میں لگ گئی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو صحافت پر انشا پردازی کا رنگ غالب ہوا جو تہذیب الاخلاق کے صفحات پر نظر آتا ہے۔ پھر بیسویں صدی میں ابوالکلام آزاد محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں نے الہلال، ہمدرد اور زمیندار کے ذریعہ اردو صحافت کو نقطہ عروج پر پہونچا دیا اور اس کی زبان دیگر نثری اصناف کے لئے باعث رشک بن گئی۔ ترقی پسند تحریک نے اردو اور سماج کے رشتے پر زور دیا تو ہماری صحافت میں زندگی کی سچائیوں اور مظلوم طبقات کے دکھ درد کو جگہ ملنے لگی۔ آزادی کی لڑائی میں اردو صحافت نے ایک انقلاب آفریں رول ادا کیا مگر زبان و بیان کے پہلو سے ہمارے اخبارات کے معیار میں کوئی پستی یا زوال نہیں نظر آتا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک اردو صحافت میں زبان و بیان کے اعتبار سے خاصی رنگارنگی اور خاصے نشیب و فراز نظر آتے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں اور اس سے اردو کے لسانیاتی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد اور اردو نثر کے مختلف اسالیب کے ارتقاء کا اندازہ لگانا آسان ہوتا ہے۔

اردو صحافت کی ابتدا بنگال سے ہوئی اور سب سے پہلا اردو اخبار کلکتہ سے ۱۸۲۳ء میں شائع ہوا جس کا نام تھا 'جام جہاں نما' اس کے ایڈیٹر تھے منشی سدا سکھ۔ اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس اخبار میں خبروں کے علاوہ مضامین بھی ہوتے تھے جو زیادہ تر انگریزی یا فارسی سے ترجمہ کر کے دیئے جاتے تھے۔ ایک پرچے میں ۴، ۵ خبروں سے زیادہ نہ ہوتیں۔ زیادہ زور مضامین پر دیا جاتا تھا۔ خبریں دلچسپ نہ ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی

غزلیں بھی چھپتی تھیں۔ یہ اخبار ۴ سال آٹھ ماہ چھپا پھر ۱۸۲۸ء میں بند ہو گیا۔

۱۸۳۶ء میں دہلی سے ہفتہ وار دہلی اردو اخبار شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر تھے جنھیں غدر ۱۸۵۷ء میں ایک انگریز کے قتل کے الزام میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو اخبارات کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جگہ جگہ سے بے شمار اردو اخبارات شائع ہوئے۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے الفاظ میں ۱۸۲۴ء سے ۱۸۹۹ء تک کم و بیش پانچ سو اخبارات ورسائل ہندوستان کے کونے کونے سے نکلے۔ اس عہد کے اخبارات سے اس زمانہ کی علمی ثقافتی اور معاشرتی تاریخ مرتب کرنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ مرزا غالب کے بارے میں اسعد الاخبار نے ۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء میں خبر شائع کی کہ بہادر شاہ ظفر نے انھیں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور فرمایا ہے۔

انیسویں صدی میں ایسے بھی اخبار شائع کئے جاتے تھے جن کی زبان اردو ہوتی تھی مگر دیوناگری رسم الخط میں شائع کئے جاتے تھے۔ ایسے دو اخبار ہیں 'سدھاکر اخبار' اور 'شملہ اخبار'۔

انیسویں صدی کی اردو صحافت پر ادبی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ خبریں اس طرح مرتب کی جاتیں کہ ہر جملہ ردیف و قافیہ کا پابند ہوتا۔ کبھی کبھی جملوں کا وزن بھی برابر ہوتا۔ مثلاً واجد علی شاہ کی معزولی پر اخبار 'طلسم لکھنؤ' نے لکھا "زبان کی گردش نے عجب ویرانی دکھائی، تمام خلق کو رقت تھی، یہ حیرانی دیکھ کر حسرت تھی، دیکھنے والوں کا دل کڑھتا تھا مگر کیا ہو سکتا تھا، ایک دوسرے کا منہ تکتا رو تا بلکھتا تھا"۔ اسی طرح کی زبان 'سحر سامری' میں بھی ملتی ہے جو ایک ہفتہ وار اخبار تھا اور ۱۸۵۶ء کے آس پاس چھپتا تھا۔

اخبارات میں چھپنے والے اشتہارات کی زبان بھی رنگین ہوتی بلکہ کبھی کبھی نظم میں اشتہار بھی چھپتا تھا۔ عام طور پر اخبار کے سرورق پر اشعار لکھے جاتے۔ مثلاً اعظم الاخبار میں یہ شعر لکھا ہوتا:

اسم اعظم کا وظیفہ مطبع اعظم میں ہے
نام سے جس کے یہ کاغذ اعظم الاخبار ہو

ان اخبارات میں طنزیہ مضامین بھی چھاپے جاتے تھے جن میں تہذیب و شائستگی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہ اخبارات انیسویں صدی میں حکومت پر تنقید بھی کرتے اور ان پر جرمانے بھی ہوتے۔ ایڈیٹروں کو سزائیں بھی دی جاتیں۔ ان سب باتوں کا تذکرہ بھی اس صدی کے اخباروں میں موجود ہے۔ مثلاً نور الانوار اخبار میں یہ خبر ۸ اگست ۱۸۸۵ء کو ملتی ہے "گیا کے ایک وکیل صاحب نے 'بنگالی پنچ کلکتہ' پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کیا ہے"۔ "ایڈیٹر رفیق ہند ۱۱ اپریل کو رہا ہوئے"۔

اس صدی میں اخبارات اپنے نامہ نگار بھی رکھنے لگے اور مختلف شہروں میں ان کے تقرر کے لئے اشتہار بھی دینے لگے۔ ان اخبارات میں ذاتیات کے بجائے معروضی انداز سے خبریں چھپنے لگیں۔ البتہ اس صدی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ صحافت میں نہیں آئے بلکہ یہ کم پڑھے لکھے لوگوں کا مشغلہ تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ تب تک فارسی سے زیادہ مانوس نہیں تھا۔

بیسویں صدی میں اردو صحافت نے بہت ترقی کی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس میدان میں آئے۔ ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور ظفر علی خاں جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات نے اس وادی میں قدم رکھا۔ اس دور کی صحافت میں باغیانہ عنصر نمایاں ہو گیا۔ آزادی ہند کی تحریک کے یہ اخبارات ترجمان ہو گئے۔ لکھائی چھپائی ترتیب ہر اعتبار سے اردو اخبارات نے ترقی کی۔

بیسویں صدی کے شروع میں اردو میں "تہذیب الاخلاق" "اودھ اخبار"۔ "مخزن"، اردو معلی، تہذب نسواں اور ہمدم لکھنؤ موجود تھے۔ اس کے بعد 'وکیل امرتسر، پیسہ اخبار لاہور، الہلال و البلاغ کلکتہ، مدینہ بجنور،

زمیندار لاہور شائع ہوئے۔ اسی زمانہ میں 'زمانہ' اور 'احرار' کلکسہ سے روزنامے کی شکل میں نکلے۔ مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام، حسرت موہانی اور ظفر علی خاں نے صحافت کے میدان میں دھوم مچادی۔ زمیندار جیسی مقبولیت اردو میں کسی اخبار کو نہ ملی جو ۱۹۴۷ء تک شان سے نکلتا رہا۔

ان اخباروں نے عوام میں زبردست ذہنی بیداری پیدا کی اور آزادی کی جد و جہد کو تقویت پہونچائی۔ بیسویں صدی میں اردو صحافت ملک کے بدلے ہوئے حالات کے ساتھ قدم ملا کر چلنا چاہتی تھی۔۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے اولیں شمارہ میں فرمایا تھا: ''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیان و نقصان مین آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں''۔

مولانا محمد علی جوہر نے صحافیوں کے لئے ایک ضابطہ اخلاق مرتب کیا اور کامریڈ کی ٦ جون ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں یہ لکھا کہ صحافی کو ذاتیات سے مبرا ہونا چاہئے۔ مبالغہ آرائی اور قصہ خوانی نہیں کرنی چاہئے۔ عبارت آرائی اور چٹکلہ بازی کے بجائے متانت اور سنجیدگی اختیار کرنی چاہئے۔ اس کا مقصد منتہا اپنی قوم کو فائدہ پہنچانا ہو نہ کہ کسی دوری قوم کو نقصان پہونچانا۔ صحیح اور مصدقہ خبریں چھاپنی چاہئے۔ مذہبی بحثوں سے بچنا چاہئے۔ ایڈیٹوریل تازہ اور اہم واقعات پر ہونی چاہئے۔ مولانا اکرم خاں ۲۸ جولائی ۱۹۲۰ء کو اپنے اخبار 'زمانہ کلکتہ' کے اداریہ میں لکھتے ہیں:

> ''اٹھو کمر بستہ ہو جاؤ اے فرزندان اسلام، کارواں تیار ہے۔ فریاد جرس بلند ہو رہی ہے۔ ہمت تم کو پکارتی ہے۔ غیرت تم کو ابھارتی ہے۔ واقعات تم کو دعوت عمل دے رہے ہیں۔ مشکلات مشعل دکھارہی ہے۔ مصیبتیں راستہ بتارہی ہیں............؟''

اس طرح اردو صحافت نے اس صدی کے وسط تک انقلاب آفریں رول ادا کیا۔ آزادی ہند کے بعد اگرچہ اردو کو ناساز گار حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن بہت بڑی تعداد میں مختلف شہروں سے اردو اخبارات و رسائل نکلتے رہے اور انھوں نے ملک کے مختلف مسائل میں عوام کی رہنائی کا فریضہ انجام دیا۔ آزادی کے بعد اردو صحافت کا اسلوب خاصا عام فہم اور لب و لہجہ عوامی ہو گیا۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کو کثرت کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ مبالغہ آرائی اور ہجو کے بجائے توازن و وقار کے ساتھ ہر مسئلہ پر مدلل نثر میں اظہار خیال کیا جانے لگا۔ علماء و اہل علم کی توجہ اگر صحافت کی طرف نہیں رہی اور ارو کے ادیبوں نے بھی اسے لائق اعتنا سمجھنے میں تکلف سے کام لیا لیکن بمبئ و حیدر آباد اور لکھنؤ کے موقرار دو روزناموں سے اردو کے ممتاز اور صاحب طرز اہل قلم وابستہ رہے۔ غرض اردو صحافت ڈیڑھ سو سال کے سفر کے بعد بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اسلوب اور اظہار و ابلاغ کے اعتبار سے ایک مقبول عام کار آمد اور عوام و خواص دونوں کے دلوں کو جیتنے والی نثر کو فروغ دینے میں کامیاب ہو چکی ہے۔

میں اس تحقیقی مقالہ کے لئے اپنے تحقیقی رہنما ڈاکٹر طلعت حسین نقوی، سابق صدر شعبہ ڈاکٹر سید عبد الباری اور موجودہ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر شہناز عابدی کا ممنون ہوں جن کی رہنمائی اور مشورے اس مقالہ کی تکمیل میں بے حد معاون ثابت ہوئے۔ اگر میں اپنے نوجوان دوست طارق اشرف ندوی کا شکریہ نہ ادا کروں تو یہ ان کے خلوص کی توہین ہو گی۔

باب اول

اردو صحافت کے آغاز کے وقت اردو نثر کے اسالیب اور صحیفہ نگاری کی مختلف صورتوں کا جائزہ

اردو نثر کے اقسام

نثر انسان کے خیالات کی ترسیل کا ایک ذریعہ ہے جو نظم سے ان معنوں پر مختلف ہے کہ اس میں موزونیت و آہنگ کا وہ التزام نہیں ہوتا جو نظم میں ہوتا ہے۔ بقول نجم الغنی۔

"کلام ناموزوں نثر ہے اور موزوں نظم ہے" ۔(۱)

نثر کے ذریعہ ہم اپنے افکار و خیالات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ رانگ مین نثر کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے:

"نثر بول چال کی عام زبان ہے۔ یہی زبان جب کبھی کبھی ادبی اغراض و مقاصد سے ہمکنار ہو کر ایک خاص آہنگ پیدا کر لیتی ہے تو شعر سے قریب ہو جاتی ہے۔ نثر روزمرّہ زندگی کے عام تجربات کے سلسلے کے اظہار کا نام ہے یہ اظہار گفتگو اور تحریر دونوں صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے" ۔ ۲

یعنی وہ زبان جو روزمرّہ استعمال کی جاتی ہے اور جس میں کوئی تکلف و تصنع نہیں ہوتا وہ نثر ہے لیکن کبھی کبھی اس میں ادبی رنگ اور جمالیاتی آرائش کچھ خاص مقاصد کے لئے پیدا کی جاتی ہے اسے ادبی نثر کہتے ہیں، نثر میں واقعاتی سچائیاں اور دلائل ہوتے ہیں۔ اس کا انسان کے افکار سے گہرا تعلق ہوتا ہے اس کے برعکس شاعری کا جذبات و احساسات کی دنیا سے گہرا ربط ہے۔ آئی اے رچرڈ لکھتے ہیں:۔

"زبان کا استعمال دو طریقوں پر ہوتا ہے سائنسی اور غیر

۱۔ بحر الفصاحت۔ نجم الغنی رامپوری، نولکشور پریس ۱۹۰۷ء ص ۱۱۹

۲۔ ماڈرن انگلش ڈکشنری، رانگ مین ۱۹۷۶ء ص ۸۹۶

سائنسی، سائنسی استعمال یہ ہے کہ بیان کو محض حوالے کے لئے استعمال کیا جائے خواہ اس کا نتیجہ صحیح ہو یا غلط۔ اس طرح زبان کا جذباتی استعمال یہ ہے کہ بیان کو جذبہ اور ذہنی کیفیت کے اس تاثر کے اظہار کے لئے برتا جائے جو اس حوالے سے پیدا ہوتا ہے۔" ۱؎

دوسرے الفاظ میں نثر اس وقت سائنسی استحکام حاصل کر لیتی ہے جب اس پر سادگی سلاست اور منطقی استدلال ہوتا ہے۔ حوالے کے لئے استعمال کا مفہوم یہ ہے کہ اس پر واقعاتی سچائیاں ہوں اور یہ صداقت و حقیقت پر مبنی ہوں۔

نثر کی اس کی ساخت آہنگ الفاظ اور جملوں کی نحوی ترتیب کے اعتبار سے ۴ اقسام کی گئی ہیں:۔

(۱) نثر مرجز (۲) نثر مسجع (۳) نثر مقفّٰی (۴) نثر عاری

مولوی نجم الغنی کے الفاظ میں نثر مرجز وہ نثر ہے جس میں وزن شعر ہو اور قافیہ نہ ہو۔ غالب نے بھی اس کی وضاحت یوں کی ہے۔

"نثر مرجزوہ ہے کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو"۔ ۲؎

نثر مسجع وہ ہے کہ الفاظ فقریں وزن میں برابر ہوں اور حرف آخر بھی موافق ہوں

ڈاکٹر عنوان چشتی بھی لکھتے ہیں۔

"مسجع وہ نثر ہے جس کے دو فقروں کے آخری الفاظ برابر ہوتے ہیں ۳؎

۱؎ پرنسپلز آف لٹریری کریٹی سزم۔ آئی اے رچرڈز۔ نیویارک ۱۹۳۸ء ص ۲۶۷

۲؎۔ ادبی خطوط غالب۔ مرتبہ محمد حسن عسکری ۱۹۳۸ء انوار المطابع لکھنؤ ص ۶۳

۳؎ اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت۔ ص ۲۹۵

نثر مقفّیٰ کے بارے میں نجم الغنی لکھتے ہیں۔

""نثر مقفیٰ وہ جو مرجز کے برعکس ہو یعنی قافیہ رکھتی ہو اور وزن نہ ہوں۔""[۳]

نثر عاری سے مراد وہ نثر ہے جس میں مرجز اور مقفیٰ کا انداز نہیں ہوتا بلکہ یہ سادہ و عام فہم ہوتی ہے۔ اس میں سلاست ہوتی ہے۔ یہ برجستہ و بے ساختہ ہوتی ہے۔ نجم الغنی اس کو روزمرّہ بھی کہتے ہیں پھر نثر عاری کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نثر سلیس و نثر دقیق۔ دقیق مخلق اور ثقیل الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے اور سلیس پر عام فہم الفاظ ہوتے ہیں

اس کے علاوہ نثر کی ایک اور تقسیم بدلی گئی ہے (۱) بول چال کی نثر (۲) علمی نثر (۳) ادبی نثر

ادبی نثر کی بھی دو قسمیں ہیں۔

(۱) سادہ ادبی نثر۔ اس میں تنقید تحقیق، تجزیہ خاکہ مکاتیب انشائیے اور صحافیانہ تحریریں سب شامل ہیں

(۲) ادبی تخلیقی نثر۔ اس میں افسانہ ناول ادب لطیف وغیرہ اصناف ادب کی تخلیق ہوتی ہے ۔ صحافت میں بول چال کی نثر، علمی نثر اور ادبی نثر تینوں کا مرکب سامنے آتا ہے۔ اس میں عام کاروباری معاملات، علمی موضوعات، منطقی و عقل انداز بیان کے ساتھ ادب کی گہری آمیزش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحافت کو ادب ہی کا ایک حصہ تصور کیا گیا ہے۔

اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے پہلے بزرگوں کے اقوال، سفرناموں، تراجم قرآن پاک کی تفاسیر کی شکل میں فروغ پذیر تھی مگر ابھی عام کاروباری زندگی اور مختلف علوم وفنون سے اردو نثر کا واسطہ نہیں پڑا تھا

۳۔ بحر الفصاحت۔ ص ۱۱۲۱

۔شمالی کی مہذب کھڑی بولی کی پہلی نثری تصنیف کربل کتھا ہے جو ۱۷۵۲ء میں لکھی گئی۔بقول ڈاکٹر شہناز انجم

"اس میں روانی شادابی شگفتگی بھی ہے اور مقفّی و مسجع انداز کی دلکشی بھی" ۱؎

بہر حال فورٹ ولیم کالج تک اردو نثر اسلوب اور ارتقا کے اعتبار سے کوئی خاص سفر طے نہ کر سکی۔انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے آغاز سے پہلے جنگ آزادی تک اردو نثر ارتقا کی منزلیں تیز رفتاری سے طے کیں۔فورٹ ولیم کالج سے داستانی ادب اردو میں داخل ہوا اور متعدد داستانیں فارسی و عربی سے اردو کے پیراہن میں منظر عام پر آئیں مثلاً قصہ مہر افروز دلبر،الف لیلیٰ اور بوستان خیال انمیں سے کچھ فورٹ ولیم کالج سے پہلے وجود میں آچکی تھیں۔نوطرز مرصع جسے میر محمد حسین عطاخاں تحسین نے ۱۷۷۵ء میں لکھا۔اس میں بقول ڈاکٹر شہناز انجم۔

"تحسین نے وہ مرصع و مسجع اور شاندار اسلوب تخلیق کیا جو فارسی اسلوب سے ٹکر لے سکے" ۲؎

اس کے منظر عام پر آنے سے اردو کے نثری ادب میں تہلکہ مچ گیا۔اگر بقول گیان چند"۔

"اس کا اسلوب مخلق، مصنوعی اور پر تکلف ہے اور فارسی و عربی کے موٹے لغات کی بھرمار ہے تیز توازن و ہمواری کا فقدان ہے" ۳؎

پھر بھی اس کتاب نے اردو نثر کو اپنے پیروں کھڑا کرنے کی کوشش کی اور آگے چل کر میر امن کی باغ و بہار کے لئے اس نے زمین ہموار کر دی۔

۱؎۔اردو نثر کا ارتقا۔ڈاکٹر شہناز انجم۔جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۸۱

۲؎ " " " " " " ص ۱۱۵

۳؎۔اردو کی نثری داستانیں۔گیان چند جین۔ص ۱۴۳

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین و مترجمین نے اردو نثر کو اس لائق بنا دیا کہ یہ زندگی کے جملہ شعبوں میں کار آمد بن سکے۔ میر امن کی باغ و بہار حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی اور آرائش محفل، خلیل علی خاں اشک کی داستان امیر حمزہ، مظہر علی ولا کی مادھونل اور کنڈلا و بیتال پچیسی، نہال چند لاہوری کی مذہب عشق ، کاظم علی جوان اور للوّلال جی کی سنگھاسن بتیسی نے اردو نثر کو تندرست و توانا بنایا۔ خاص طور پر میر امن نے باغ و بہار کے ذریعہ اردو کو ایک متحرک اور جاندار اسلوب عطا کیا۔ ڈاکٹر شہناز انجم کے الفاظ میں۔

"ان کے الفاظ پر ماہر قلم کی سی چابکدستی ہے۔ واقعات کے تسلسل کو قائم رکھا اور جزئیات پر توجہ دینے کا فن انکو خوب آتا ہے۔ انھوں نے باغو بہار میں جو زبان استعمال کی ہے وہ ہندوستانی زبان ہے جس پر دہلی کے روزمرہ کی چھاپ ہے۔ محمد یحیٰ تنہا کا یہ خیال درست ہے کہ:۔ "اس کی زبان نہایت صاف شستہ اور بامحاورہ ہے۔ اس کی اردو فصیح اور مستند ہے انکی نثر کو میر تقی میر کے ہم پلہ مانا گیا ہے۔" [1]

ڈاکٹر سید عبد اللہ کا خیال ہے کہ:۔

"میر امن نے ہمیں بولتی جیتی جاگتی نثر سے روشناس کرایا جس میں روز مرہ کے علاوہ ماحول کی زندگی کا انعکاس بھی موجود ہے اور نثر کی اختیار میں حیات کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔" [2]

فورٹ ولیم کالج کے باہر لکھی گئی نثری کتب میں رانی کیتکی کی کہانی (انشاء اللہ خاں انشاء) گلشن نو بہار و نورتن (محمد بخش مہجور) فسانہ عجائب (رجب علی بیگ سرور) باغ عشق (بینی نرائن جہاں) قصہ گل و صنوبر

---

[1]۔ میر المصنفین۔ محمد یحیٰ تنہا۔ جلد اول ۱۹۴۸ لاہور ص ۸۲

[2]۔ میر امن سے عبد الحق تک۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ۔ ص ۱۰

(منشی نیم چند کھتری) بوستان خیال (میر تقی خیال) شہرت رکھتی ہیں۔ سرور کے فسانہ عجائب کے ابتدائی متن کے مقدر میں انھوں نے غرض وغایت اس تصنیف کی بیان کی تھی:۔

"جو روزمرہ اور گفتگو ہماری تمھاری ہے یہی ہو ایسا نہ ہو کہ رنگین عبارت کے واسطے آپ وقت طلبی کریں اور ہم ہر فقرہ کے معنی فرنگی محل میں پوچھتے پھریں۔" ۱؎

مگر اس کے باوجود سرور کے خیالات اکثر ڈاکٹر گیان چند کے الفاظ میں۔

"بوجھل زربفتی پوشاک میں ملبوس ہیں۔ ان کی نثر کا لطف دل کے لئے نہیں دماغ کے لئے ہے۔ اسے پڑھ کر وجد آنا ممکن نہیں" ۲؎

داستانوں کے علاوہ اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں مکتوبات کے ذریعہ اردو نثر کو فروغ حاصل ہوا اور چند مکتوب نگاروں کے نام لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں مثلاً خواجہ غلام امام شہید، خواجہ غلام غوث بیخبر، رجب علی بیگ سرور، واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات نیز مرزا غالب۔

غلام امام شہید نے اردو خطوط نویسی سکھانے کے لئے اس فن پر ایک کتاب اور نمونے کے خطوط لکھے اس کا نام "انشائے بہار۔ بے خزاں" ہے۔ پھر بے خبر، سرور، واجد علی شاہ و بیگمات و مرزا غالب کے خطوط نے اردو نثر کے قافلے کو آگے بڑھایا اور علم و فن کے مختلف شعبوں میں اردو نثر کے لئے راہ ہموار کی۔ ان خطوط کی زبان معیاری و شگفتہ ہے اور ان سے اس دور کی نثر کے ارتقا کا سراغ ملتا ہے ڈاکٹر شہناز انجم کے الفاظ میں:۔

"انھوں نے انسانی جذبات اور مختلف موضوعات کی وضاحت کے لئے نئے نئے اسالیب تلاش کئے۔ اور نئے ذخیرہ الفاظ کو برتا۔ اس زمانے میں اردو نثر میں

۱؎۔ بحوالہ فسانہ عجائب کا بنیادی متن۔ مرتبہ محمود الٰہی ۱۹۷۳ء دہلی ص ۴۶

۲؎۔ اردو کی نثری داستانیں گیان چند جین ص ۳۶۱

دواسالیب مروج تھے ایک وہ جو قدیم روایت کا امین ہے جس میں فارسی زبان کی جاہ و حشمت کی پرچھائیاں رقصاں ہیں۔ درباری داری اور بندہ پروری کے تکلفات ہر سطر اور ہر جملہ میں پنہاں ہیں، مسجع اور مقفی عبارتیں کاغذ کو زینت بخشتی ہیں اور دوسرا جدید اسلوب ہے جو سادہ اور معیاری اسلوب کہا جاسکتا ہے جس میں بانکپن اور معصومیت ہے، سچائی اور بے تکلفی ہے، عربی و فارسی جملوں اور ترکیبوں کی جگہ مانوس اردو الفاظ اور سادہ ترکیبیں ہیں جس میں الفاظ کے حریری پردوں سے دھڑکتے ہوئے دلوں کا آہنگ سنائی پڑتا ہے۔"[1]

اس عہد کی اردو خطوط نویسی میں یہ دونوں اسالیب بیان موجود ہیں لیکن مرزا غالب کے خطوط نے اردو نثر کی شاہراہ متعین کر دی اور بالآخر اردو صحافت کا کارواں بھی اسی شاہراہ پر غدر ۱۸۵۷ کے بعد چل پڑا۔ ان خطوط کی تاریخ ساز اہمیت کا اعتراف جملہ اصحاب نظر نے کیا ہے۔ بقول خواجہ احمد فاروقی:۔

"نئی صورتوں کی صبح طلوع ہوئی تو رات کا غازہ دھل گیا اور نرگسی آنکھوں کا سرمہ بھی بہہ نکلا۔"[2]

مرزا آفاق حسین کے الفاظ میں:۔

"اگر مرزا نے آج سے سو سال پہلے سادہ اور بے تکلف انداز تحریر اختیار نہ کیا ہوتا تو شاید اس وقت ہماری زبان میں بھی طرح کی عبارت آرائی کی جاتی اور ہم اسی طرح قوافی کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے۔[3]

۱۔ ۱۔ادبی نثر کا ارتقا۔ شہناز انجم۔ نئی دہلی ص ۲۷۹

۲۔ ذوق و جستجو۔ خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی ص ۱۳۱ ۳۔ نادرات غالب۔ مرتبہ آفاق حسین مشہور پریس کراچی ۱۹۴۹ ص ۶۵

غرض گذشتہ سو سال کے تجربات و نقوش کی راہنمائی سے اردو صحافت نے انیسویں صدی کے ربع اوّل میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔

صحافت کا آغاز دنیا کی ہر زبان میں اسی روز سے ہو جاتا ہے جب کوئی معاشرہ اپنے ترسیل نظام کو مرتب کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ہماری زبان سے نکلنے والا ہر لفظ کوئی نہ کوئی خبر دیتا ہے اور اس کے ذریعہ ہم اپنے احساسات اور مشاہدات کو دوسروں تک منتقل کرتے ہیں۔ ماضی بعید میں شیلے کے الفاظ میں:۔

"قاصد نقیب شعراء کرام، کافی ہاؤس میں ہونے والے اجتماعات اور ان کی تحریری روداد، کلیسا کے پادری ڈھنڈورچی وغیرہ سب ایسے ذرائع تھے جو انسان کی اطلاعات ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کے لئے موجود تھے۔[1]

ایک مدت تک زبانی خبر رسانی و صحافت کا دور دورہ تھا پھر جب ادب کی تخلیق ہوئی تو صحافت نے بھی ادب کا سہارا لیا۔ تحریر کے آغاز نے صحافت کو جلا بخشا اور قلمی خبر نامے سامنے آئے۔ شیلے کے الفاظ پر سب سے پہلا خبر نامہ مطبوعہ صورت پر چین سے چودھویں صدی میں منظر عام پر آیا۔ سولہویں صدی میں اسے ایک گزیٹا (سکے) کے عوض فروخت کیا جاتا تھا بعد انگریزی اخبار کا نام اسی نام پر رکھا گیا۔

صحافت اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اگرچہ صافت کی زبان اور انداز تحریر خصوصی ہوتا ہے پھر بھی یہ ادب کی ہی ایک شاخ ہے اور ادب کے اسالیب میں ہونے والے تغیرات کا انعکاس سب سے پہلے صحافتی ادب میں نظر آتا ہے۔ شیلے کا خیال ہے کہ:۔

"صحافت ادب ہی کی ایک شاخ ہے۔ آج کے دور کے مصنفوں شعراء اور

[1] ڈکشنری آف ورلڈ لٹریچر۔ شیلے۔ ۱۹۴۳ء

ناول نگاروں کا ایک بڑا حصہ اخبارات کے دفاتر میں ہی تربیت پاتا ہے''۔

اس حقیقت کو ممتاز اردو صحافی پروانہ ردولوی ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:۔

''ہر دور میں اعلیٰ پایہ کے ادیب اخبارات سے وابستہ رہے ہیں چاہے وہ اورنگ زیب کے زمانے کے اخبار نویس سید محمد بلگرامی اور میر غلام علی آزاد ہوں یا بعد کے زمانے کے سدا سکھ لعل، مولوی باقر، سر سید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی عبدالحلیم شرر وغیرہ۔ اردو صحافت نے اردو زبان کو فروغ دے کر ادبی زبان بنانے کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں اس سے لاکھ چشم پوشی کی جائے مگر جب کوئی بھی اردو زبان کے فروغ کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ سب سے پہلے اردو صحافت کا ہی ذکر کرے گا جس نے اردو کے نثری ادب کا باقاعدہ آغاز کیا اور اردو شاعری کو بند کمروں اور نجی محفلوں سے عوام تک پہنچا کر اسے مقبول بنایا۔'' [1]

اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں اردو صحافت سامراجی ماحول سے سخت ٹکرلی اور نظم و نثر کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا اور درباداری کے تنگ کوچے سے مزاحمت اور حریت کی پھیکی فضا کی طرف اردو ادب کی راہنمائی کی۔ پروانہ ردولوی کا یہ دعویٰ درست ہے کہ۔

''آج ہندوستان کی تحریک آزادی کی کوئی بھی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں کہی جا سکتی جب تک اردو صحافت سے تاریخ لکھنے والا استفادہ نہ

---

[1]۔ اردو صحافت کا استغاثہ۔ پروانہ ردولوی۔ حیا پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۹۴ء ص ۴۷

کرے۔۱۸۲۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کی ہندوستان کی مختلف تہذیبی سیاسی اور عملی سرگرمیوں کا کوئی بھی گراف اس وقت تک مکمل اور مستند نہیں کہا جاسکتا جب تک اردو صحافت سے استفادہ نہ کیا جائے۔اگر اردو صحافت نہ ہوتی تو ہندوستان کی تاریخ سنی سنائی باتوں اور افواہوں سے مرکب ہوتی۔ [۱]

غرض اردو صحافت نے ادب کے آغوش میں آنکھیں کھولیں۔

۱۔اردو صحافت کا استغاثہ۔پروانہ ردولوی۔حیا پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۹۴ء ص ۷۵

اردو صحافت کا آغاز

ہندوستان میں اردو صحافت کے آغاز سے پہلے فارسی زبان میں اخبار کی اشاعت شروع ہو گئی تھی سب سے پہلے "جام جہاں نما" پھر "مرأۃ الاخبار" نکلنے شروع ہوئے۔ اس وقت پورے ملک پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ انگریز ہر اس شئے سے چونکتے تھے جو ہندوستانیوں کو ان کی غلامی کے بندھن کو توڑنے پر آمادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ آزاد صحافت کے نشو نما کو وہ کس طرح برداشت کرتے بقول محمد عتیق صدیقی:۔

"انگریزوں کی دور بیں نگاہوں نے اس حقیقت کو دیکھ لیا تھا کہ اخبار اور انگریزی راج ہندوستان میں ایک ساتھ نہ چل سکیں گے۔ اس سلسلے میں سر جان مالکم کی ایک طویل تقریر کے اقتسابات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جو انھوں نے ۹جولائی ۱۸۲۴ء کو ایسٹ انڈیا ایکس چینج کے ایک جلسہ میں کی تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے اپنے ساتھی مسٹر ایڈم کی وکالت کی تھی کیوں کہ مسٹر ایڈم نے ہندوستان کے انگریزی اخبارات کے ساتھ جو جابرانہ روش اختیار کی تھی اس نے انگلستان میں ایک ہل چل سی ڈال دی تھی سر جان نے اپنی تقریر میں کہا تھا:۔ 'جس سلطنت میں غیر ملکیوں کی حکومت ہو وہاں حقیقی معنوں میں آزاد اخبار جاری کرنا ناممکن ہے۔ اہل ہند کے دو بڑے طبقے ہندو اور مسلمان ہیں ہماری حکومت سے پہلے اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کو سارے ہندوستان میں عملداری تھی اس لئے فطرتاً وہ ہماری حکومت سے بے زار ہیں۔ ہندو تعلیم یافتہ جماعتوں بالخصوص برہمنوں کو بجا اندیشہ ہے کہ

ہمارے عروج سے انھیں مزید زوال نصیب ہوگا۔وہ ہماری قوت کو نقصان پہنچانے
کے ہر موقع کی تاک میں رہیں گے اور انھیں بہت سے ایسے مواقع مل جائیں گے اور
میرے نزدیک وہ بے چینی بدامنی اور غدر پھیلانے کے فن میں خوب ماہر ہیں۔اب
یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا یہ امید کرنا عقل مندی میں داخل ہے کہ ہماری کامیابی
سے جن لوگوں کی وقعت دولت وثروت اور حکومت تباہ و برباد ہوگئی ہے وہ ہماری
حکومت سے نفرت وعداوت نہ خود کریں گے نہ دوسروں میں پیدا کرنے کی کوشش
کریں گے ؟اگر نہیں تو پھر ان کے ہاتھ میں اخبارات کی آزادی دے دینا کیا قرین
مصلحت دانش مندی ہے''۔[1]

سب سے پہلے انگریزوں نے تثلیث کے پرچار کے لئے کئی اخبارات جاری کئے۔سی رامپور کی عیسائی مشنری نے بنگالی سے اور انگریزی زبان میں رسائل جاری کئے۔محمد عتیق صدیقی نے راجہ رام موہن رائے کو ہندوستانی اخبار نویسی کا سالار کارواں قرار دیا ہے جنھوں نے بنگلہ زبان پر سمبد کمودی اور فارسی زبان میں مراۃ الاخبار ۱۸۲۲ء میں جاری کیا۔''پرجاجہاں نما'' بھی اسی سال ۱۸۲۲ میں منشی سداسکھ لعل کی ادارت میں جاری ہوا۔

پھر اس کے ضمیمہ کے طور پر اردو میں جام جہاں نما ۱۸۲۳ سے شائع ہونے لگا۔یہ اردو کا پہلا اخبار تھا اور اس کی ضخامت ۴ صفحات تھی۔اخبار کی ایک نوٹس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو جام جہاں نما اس لئے جاری کیا گیا تھا کہ فارسی جام جہاں نما کے یوروپین خریداروں کے لئے اخبار کو دلچسپ پر لطف اور مفید بنایا جاسکے۔اس اخبار میں

۱۔(بحوالہ ہندوستانی اخبار نویس۔محمد عتیق اللہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۷ص ۱۱۹

انگریزی و فارسی مضامین کے تراجم اور اشعار بھی چھپتے تھے۔ اس وقت تک سرکاری زبان فارسی تھی اس لئے اردو میں صحافت کو کوئی وزن و وقار نہ حاصل ہو سکا۔ خبریں بہت کم ہوتی تھیں اور مضامین بھی غیر دلچسپ تھے۔ انداز تحریر فارسی نثر سے متاثر ہے اور انداز بیان پر قدامت کا سایہ نظر آتا ہے۔ ادبی چاشنی اور دلکش انداز بیان مفقود ہے۔ یکم مارچ ۱۸۲۶ء کے جام جہاں نما میں یہ خبر ملاحظہ ہو:۔

"سب خاص و عام کی خدمت میں گذارش کیا جاتا ہے کہ انگلینڈ کی سلطنت کا حال انگریزی تاریخ میں مفصل لکھا ہوا ہے اور بنگلہ زبان میں بھی وہ تاریخ ترجمہ ہوئی مگر اردو زبان کے سمجھنے والے اس احوال سے خوب اطلاع نہیں رکھتے۔ اس واسطے مناسب ہوا کہ سوئم جارج کے عہد سے انگلینڈ کی سلطنت کا حال بر سبیل اختصار لکھا جاوے اس واسطے کہ ایک ہفتہ کاغذ میں گنجائش محال ہے تھوڑا تھوڑا لکھا جاوے گا"۔ [1]

اس اخبار کے ابتدائی دور کے شماروں میں جو نثر ملتی ہے وہ ہے بے حد پھیکی غیر رواں اور بے لطف ہے۔ اسطرح کے جملے جگہ جگہ ملتے ہیں۔

"فرانس کی لڑائیوں کا بھی بیان جو یوروپ کے سلاطینوں سے اس ایام میں ہوئی ہیں اب اطلاع کے واسطے گذارش ہے۔ [2]

جام جہاں نما ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء کو بند ہو گیا۔ اخبار کے مالکوں کی شکایت تھی کہ قدر شناس اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے اور ان کو فارسی کا چسکہ ہے چنانچہ اعلان کیا گیا کہ ۸ صفحہ فارسی اور ۴ صفحہ اردو اخبار

۱۔ ہندوستانی اخبار نویسی۔ محمد عتیق صدیقی ص ۱۶۳

۲۔ " " " " " ص ۱۶۴

کے اب اردو کا بجائے مکمل ۱۲ صفحات فارسی زبان پر مشتمل ہوا کریں گے۔

گربچن چندن جام جہاں نما کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"جام جہاں نما اردو زبان و ادب کے ذہنی اور علمی سفر میں ایک نئی منزل ہے۔"[۱]

پروانہ ردولوی کے خیال میں یہ ایک ایسا چراغ تھا جس کے بعد کئی چراغ روشن ہوئے۔ وہ اس اخبار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"جام جہاں نما اردو نثر کو خبر نگاری کے وسیلہ سے اس قدر جاندار صنف تحریر بنادیا تھا کہ لگ بھگ ایک صدی تک اردو نثر پر اس انداز تحریر کا غلبہ رہا اور اس کا سب سے نمایاں اثر آخری دور میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کی تحریروں پر پڑا۔ انکی کتاب پھول والوں کی سیر کا مطالعہ کرچکنے والے قاری ہمارے اس دعوے کی تصدیق اخبار جام جہاں نما کی ان خبروں کے طرز تحریر کا جائزہ لینے کے بعد آسانی سے کرسکتے ہیں"[۲]

پروانہ ردولوی مسٹر گربچن کے حوالے سے جام جہاں نما کی نثر کی چند اقتسابات اس کے اسلوب کا مطالعہ کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں۔ پھول والوں کی تقریب کا ذکر ملاحظہ کریں:۔

"پھول والوں کے میلے کی تقریب سے جب حضرت جہاں پناہ (اکبر شاہ ثانی) قطب صاحب کی درگاہ میں رونق افروز ہوئے تھے۔ اکثر سواری جھولنے پر جاتی تھی۔ حضرت راگ سنتے اور زنانے بندوبست میں نہانے کا تماشہ دیکھتے۔ خواتین کس

۱۔ جام جہاں نما اردو صحافت کی ابتدا۔ گربچن چند

۲۔ اردو صحافت کا استغاثہ۔ پروانہ ردولوی۔ دہلی ۱۹۹۴ص ۶۰

کس خوبی سے آپس میں لڑتیاں اور جھنڈ کے جھنڈ باہم لپٹ کر کنارے سے پانی میں گر پڑتیاں، کوئی مسکرا کے بالوں کو لپیٹتی دوسری شرم سے انگلی دانتوں میں پکڑتی۔ کوئی پکارتی بہاؤ میں نہ جاؤ وہاں بڑا زور ہے کوئی للکارتی دوگانہ چڑھاؤ پڑاؤ دیکھو تو کیا توڑ ہے"

۱ے

دہلی کے بعد لکھنؤ کی خبر ملاحظہ ہو:۔

"حکم ہوا کہ اگلے دن بھی رام لیلا کا تماشا دیکھا جاوے۔ چنانچہ دوسرے دن چکلے کی رنڈیوں اور بھانڈوں بھگتے بازیگر، نٹ بھائیوں کے گروہ کشمیریوں کے چھوکرے، ہجڑے سب فرقے ارباب نشاط کے حکم کے مطابق گومتی پار مبارک منزل کے سامنے اکٹھا ہوئے اور بادشاہی کارخانہ جات کے ہاتھی گھوڑے آراستہ کر حاضر ہوتے۔ اسیری داس نانک شاہی نے رام لیلا کا تماشا شروع کیا۔ حضرت دیر تک تماشا دیکھا کئے اسیری داس کو فقیروں کے بھنڈارے کے لئے ہزاروں روپے رحمت فرمائے گئے"۔ ۲ے

جناب پروانہ ردولوی اس نثری اسلوب کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"خواجہ حسن نظامی سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد اور ان کے بعد ڈپٹی نذیر احمد پر لگ بھگ یہی رنگ غالب رہا ان خبروں میں جس نثر کے نمونے پیش کئے گئے تھے وہ اردو کی تحریری نثر کے اولین دور سے عبارت تھے جس کی تاسی آزاد ، حسن

۱ے جام جہاں نما۔ نمبر ۱۲۱ ۱۵ اکتوبر ۱۸۲۵ء

۲ے جام جہاں نما۔ شمارہ ۱۲۸۔ مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۲۵

نظامی نے دہلی میں ااور کسی حد تک مولوی عبدالحلیم شرر نے لکھنؤ میں کی۔ مولوی عبدالحلیم شرر کے زمانے میں اردو نثر کا روپ کافی بدل چکا تھا۔ اس پر فارسی کی گہری چھاپ نہیں رہ گئی تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب دومنھے کبوتر کا ذکر جس دل کش پیرائے میں کیا گیا ہے کیا وہ پیرایہ جام جہاں نما کے نثری پیرایہ سے ملتا جلتا نہیں ہے" ا؎

جام جہاں نما میں ایک دومنھے بچے کی خبر چھاپتے ہوئے جو نصیحت اور پند ارشاد ہوتا ہے وہ ملاحظہ ہو:۔

"اس واجب الوجود کی صفت کا کس طرح بیان کیا جاوے کہ موالید ثلاثہ میں بھانت بھانت کی شکلیں رنگ رنگ کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ حیوانات کو دیکھئے ایک بوندپانی سے سب کا ہیولا بنتا ہے اور ایک پیٹ سے کئی بچے نکلتے ہیں کہ ایک کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی۔ اس صورت سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ جو چاہے سو کرے۔ عقل کو اس کی قدرت میں دخل نہیں ۲؎

اس عبارت سے ایڈیٹر کے صحافی شعور کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ پروانہ ردولوی کے الفاظ میں ادبی شعور کی بھی غمازی ہوتی ہے"۔

"اسی طرح جام جہاں نما کی خبریں اپنے عہد کی معاشرت اور تاریخ پر بھی بدرجہ اتم روشنی ڈالتی ہیں۔ اس اخبار کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ فرسودہ نظام کے خلاف اردو صحافت برسرپیکار ہونے کی دعوت دے رہی ہے۔" ۳؎

ا؎ اردو صحافت کا استغاثہ۔ پروانہ ردولوی دہلی ص ۶۱

۲؎ جام جہاں نما۔ کلکتہ شمارہ ۱۲۰، ۲۸ ستمبر ۱۸۲۵ء

۳؎ اردو صحافت کا استغاثہ پروانہ ردولوی ص ۶۲

جام جہاں نما میں اگر مقفّٰی و مسجع عبارتیں بھی ملتی ہیں خاص طور پر قوانی کا اہتمام اس عہد کے عام مذاق کے مطابق کیا جاتا تھا لیکن عام طور پر اس کی نثر بہت سادہ اور عام بول چال والی تھی۔ اس اخبار میں تاریخ عالم گیری قسط وار شائع ہوتی اور آخری قسط پر تبصرہ کرتے ہوئے مدیر لکھتے ہیں:۔

''اورنگ زیب تیمور خاندان میں بہت لائق و فائق ہوا۔ سب علوم فنون میں اس کو بخوبی مہارت حاصل تھی رعایا پروری اور انصاف پروری جیسی اس نے کی اس کے خاندان میں دوسرے سے نہیں ہوئی۔ اورنگ زیب کی محفل میں سب طرح کے علماء فضلا عقلا حاضر تھے پر اس نے کبھو کسی سے انتظام کے باب میں مدد نہیں چاہی۔ اس مآل اندیشی سے کام کیا کہ اتفاقیہ کبھو اسکی رائے خطا کی ہو''۔

غرض اس طرح کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے پہلے اخبار نے ٹھیٹ اخباری نثر کا سانچہ تیار کر دیا تھا۔ جام جہاں نما کی خبروں میں قصہ کہانی کا اثر کارفرما نظر آتا ہے۔ خبروں کا انداز بالکل کہانی جیسا ہے۔ واقعات اس طرز پر لکھے جاتے ہیں گویا قصہ سنایا جارہا ہے۔ جملوں میں محاوروں کا کثرت سے استعمال داستانی انداز بیان کا غماز ہے۔ اس وقت کی قصہ گوئی میں یہی انداز بیان رائج تھا۔ بقول ڈاکٹر شہناز انجم۔

''اس وقت کی صحافتی نثر اور ادبی نثر کے اسلوب پر کوئی نمایاں فرق نہیں تھا ۔ جام جہاں نما میں خبریں خالص ادبی انداز لئے ہوتی تھیں اس میں صرف الفاظ کی حد تک نہیں بلکہ مفہوم کی وضاحت اور واقعہ کی تفصیل کے لحاظ سے بھی ادبیت غالب تھی۔ کہیں کہیں زبان کافی پر تکلف ہے اور عبارت پر فارسی کا اثر ہے۔ فارسی انداز بیان کے اثر نے اسلوب پر تکلف کی ہلکی پرت جمادی ہے۔''[1]

---

[1] ادبی نثر کا ارتقاء۔ شہناز انجم جامعہ نگر نئی دہلی ص ۳۲۰

جام جہاں نما کی خبروں میں واقعات کو اس قدر تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے کہ طبیعت کچھ اوب جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی ناول یا کہانی پڑھ رہے ہیں۔ بعض مقامات پر انشاپردازی اور عبارت آرائی اور کبھی کبھی مبالغہ آرائی عروج پر نظر آتی ہے مگر تکلف کے ساتھ بے ساختگی کی کونپلیں بھی پھوٹتی نظر آتی ہیں۔

اسی زمانے میں اودنت مارتنڈ نام کے دیوناگری رسم الخط کے اخبار کا اجرا ۱۸۲۶ء سے ہوا۔ جام جہاں نما کے علاوہ فارسی میں اور اخبارات منظر عام پر آئے۔ ۱۸۲۳ء میں انگریزی حکومت نے اخباروں، کتابوں چھاپے خانوں کے لئے ایک قانون پاس کیا اور بغیر لائسنس حاصل کئے ہوئے اخبار جاری کرنے کی آزادی ختم کر دی گئی۔ راجہ رام موہن رائے نے اس فیصلے کے خلاف ملک معظم سے اپیل کرتے ہوئے گذارش کی:۔

"شاہان مغلیہ جو سابق میں اس ملک کے حکمراں تھے ان کو خواہ کتنے ہی مستبدانہ اختیارات کیوں حاصل رہے ہوں لیکن ان میں جو جوش مند اور صالح ہوتے تھے وہ ہمیشہ اپنے صوبہ کے صدر مقاموں پر دو اخبار نویس متعین کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک وقائع نویس ہوتا تھا جو سارے واقعات بلا کم و کاست قلم بند کرتا تھا اور دوسرا خفیہ نویس ہوتا تھا جو ہر قابل ذکر واقعہ کی خفیہ رپورٹ مرتب کرتا تھا۔ کبھی کبھی صوبہ دار اگرچہ بادشاہ وقت کے عزیز یا دوست بھی ہوتے ہیں لیکن بادشاہ ان کی بھیجی ہوئی انتظامی رپورٹوں کی غیر جانبداری اور صداقت پر سولہ آنے بھروسہ نہیں کیا کرتا تھا۔ صوبہ داروں کی غلطیوں کی پاداش میں یا اپنے ماتحتوں کی غفلت شعاری کا موقع دینے کے جرم میں بادشاہ صوبہ داروں کو معزول بھی کر دیا کرتا تھا۔ ملک معظم

کے وفادار رعایا عاجزی کے ساتھ مستدعی ہے کہ متذکرہ بالا آرڈیننس کا نفاذ روک دیا جائے اور اس ملک کے حکام کے نام امتناعی حکم جاری فرمایا جائے کہ ملک معظم کی وفادار رعایا کو جو رعایتیں حاصل ہیں ان میں تخفیف کرنے اور ان کو حقوق کو پامال کرنے کیلئے وہ قانونی اختیارات حاصل کرنے سے احتراز کریں۔

ملک معظم کی رعایا اس عظیم قوم کی عزت کا واسطہ دے کر جس نے آپ کے خسروانہ سایہ عاطفت میں یورپ کے نجات دہندہ ہونے کا شاندار خطاب حاصل کیا ہے اپیل کرتی ہے کہ حضور اپنی لکھو کھا رعایا کو وحشیانہ طور سے پامال و برباد کئے جانے کی اجازت نہ دیں اور باشندگان ہند کو ابدی بربادی و ذلت کے سپرد نہ کریں۔"[1]

جناب محمد عتیق صاحب راجہ رام موہن رائے کی اس اپیل کی مندرجہ بالا عبارت کے انداز تحریر کو سامنے رکھ کر یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ مراۃ الاخبار میں چھپنے والے مضامین کا اسلوب اور انداز تحریر یہی رہا ہوگا۔ اس میں جرأت اظہار اور بے باکی خیال کا پہلو خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس ابتدائی عہد میں کمپنی بہادر سے خوفزدہ نہیں تھا اور لوگوں میں حق گوئی کی طاقت موجود تھی چنانچہ مسٹر ایڈم نے پریس کی آزادی ختم کرنے والے آرڈیننس کے جواز میں مراۃ الاخبار کے اقتباسات کا حوالہ دیا تھا جو اس کے خیال میں باغیانہ انداز رکھتے تھے۔

راجہ رام موہن رائے کے مراۃ الاخبار کو بند کرنے کے اعلان پر کلکتہ جرنل نے لکھا۔

"یورپ اور ایشیا دونوں بر اعظموں کے لئے یہ خوشی کا مقام تھا کہ

1- Ram Mohan Roy-Centenary Publication p.80

ہندوستان کے کچھ باشندوں نے اپنے کچھ ہم وطنوں کو روشن خیال بنانے کے لئے اخبار کو آلہ کار بنایا تھا چنانچہ جب فارسی بنگالی اور دوسری ملکی زبانوں کے اخباروں کا اجرا ہوا تو ہمارے پیش رو (مسٹر بکنگھم) نے جو حصول علم کی راہیں کھولنے کے لئے کوشاں رہا کرتے تھے اخبار کلکتہ جنرل کے دفتر میں ایک مترجم کا اضافہ کیا جس کا کام یہ تھا کہ وہ دیسی زبانوں کے مفید مضامین اور خبروں کا انگریزی میں ترجمہ کرے [1]
بعد میں انگریزوں نے کلکتہ جرنل کی اشاعت کا اجازت نامہ بھی منسوخ کر دیا۔

لارڈ ولیم بینٹنگ اور چارلس مٹکاف کے عہد میں ہندوستانیوں کو اخبار شائع کرنے اور اظہار خیال کرنے کی آزادی بڑی حد تک واپس مل گئی۔

شمالی ہند میں ۱۸۳۲ء میں آگرہ اخبار کے نام سے ڈاکٹر ہنڈرسن نے فارسی رسم الخط میں پہلا دیسی اخبار جاری کیا لیکن یہ کامیاب نہ ہوا اور نومبر ۱۸۳۲ میں انگریزی میں تبدیل ہو گیا۔ شمالی ہند کا چارسی اخبار زبدۃ الاخبار ۱۸۳۳ میں جاری ہوا۔ پھر آئینہ سکندر فارسی زبان میں کلکتہ سے شائع ہوا جسکی صفائی عبارت اور خوش بیانی کو مرزا غالب نے سراہا ہے۔ ۱۸۳۵ سے کلکتہ فارسی ہفت روزہ سلطان الاخبار جاری ہوا جس میں رجب علی بیگ سرور برابر لکھتے تھے اور جو بڑی جرأت وہمت کے ساتھ انگریزوں کے ظالمانہ طرز عمل پر تنقید کرتا تھا۔ دہلی کے نواب شمس الدین کے مقدمہ اور ولیم فریزر کے قتل پر ان کی پھانسی کی سزا کا مفصل طور پر ذکر ملتا ہے۔ دہلی سے سراج الاخبار ۱۸۴۱ سے جاری ہوا۔ اسکی زبان ٹھیٹھ مگر رنگین فارسی تھی محمد عتیق صدیقی کے الفاظ میں۔

”سراج الاخبار اس اعتبار سے ہی خاص اہمیت رکھتا ہے کہ ہندوستان کی

1-Calcutta Jaurnal 10,1823 Modern Revie 1931

قدیم اور اٹھارہویں اور انیسویں صدی نسبتاً جدید وقائع نگاری کا یہ ارتقائیاور آخری نمونہ تھا۔ جو مطبوعہ شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے[۱-۶]۔"

بہادر شاہ آخری مغل تاجدار کے عہد تک وقائع نویس کا عہدہ بر قرار تھااور مصلح الدین سید ابو القاسم مغلیہ سلطنت کے آخری وقائع نویس تھے جن کے اہتمام سے سراج الاخبار شائع ہوتا تھا۔ گارسال دی تاسی نے اسے دہلی کا سب سے بڑااخبار قرار دیاہے۔ خبروں کاانداز روزنامچہ جیسا ہوتا تھا۔

اردو صحافت اور اخبار نویسی کا عہد باضابطہ انیسویں صدی کی پانچویں دہائی سے شروع ہوتا ہے اس میں ملک کے مخصوص حالات کو خاصا دخل تھا۔ ۱۹۳۰ء سے فارسی کے بجائے اردو سرکاری زبان بن چکی تھی۔ لیکن ابھی تک اردو نثر اس حد تک فروغ پذیر نہیں ہو سکی تھی کہ وہ معاشرہ کی گوناگوں ضروریات اور زندگی کے مختلف شعبوں میں انسانی مسائل و مشاغل کا ساتھ دے سکے۔ جبکہ اردو شاعری اپنے نقطہ عروج پر تھی اور فارسی شاعری کے مدمقابل آکھڑی ہوئی تھی۔ اردو نثر میں میر امن اور فورٹ ولیم کالج کے دیگر مصنفوں کا سادہ اسلوب ابھی علمی و صحافتی ضروریات پورا کرنے کا اہل نہیں قرار پایا تھا۔ رجب علی بیگ سرور کی رنگین نثر سائینٹفک اور صحافتی مقاصد کے لئے از کار رفتہ تھی۔ لیکن اردو کے سرکاری زبان بننے کے بعد فارسی نثر کا رعب داب کم ہونے لگا۔ ادھر فورٹ ولیم کالج کے بعد دہلی کالجنے اردو نثر کے گیسو سنوارنے اور اسے مقبول عام بنانے میں غیر معمولی حصہ لیا۔ مگر اب بھی بعض ادیب و شاعر سنجیدہ اور معتبر مقاصد کے اظہار کے لئے فارسی زبان کو ترجیح دیتے تھے۔ اگرچہ عوام میں فارسی کا بالکل عمل دخل نہیں تھا۔ بقول محمد عتیق صدیقی:۔

"جہاں تک بولی کا تعلق ہے اٹھارہویں صدی کے وسط میں ایک طرف

۶-بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۵۸

گجرات سے لے کر بنگال تک اور دوسری طرف مدراس وحیدر آباد سے لے کر لکھنؤ
اور لاہور کے علاقوں تک مختلف شکلوں میں اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی لیکن جہاں
تک نثر کا تعلق ہے تصنیف و تالیف ہی کا کام نہیں بلکہ خط و کتابت بھی فارسی ہی میں
کی جاتی تھی چنانچہ اردو شعرا کے تذکرے بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ اردو
اخباروں میں اکثر خطوط فارسی زبان میں شائع ہوتے تھے۔"[۱]

۱۸۳۰ء سے اردو کو سرکاری زبان بنانے کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فیصلہ اردو نثر کے فروغ پر اچھا اثر ہوا۔ اردو زبان کے اخبارات تیزی سے نکلنے لگے ۔ ۱۸۴۰ء کے بعد بقول محمد عتیق صدیقی شمالی ہند کے قصبوں اور شہروں میں ان گنت اردو اخبار کو اجرا ہوا۔ دہلی اخبار شہر دہلی سے شائع ہونے والا پہلا اردو اخبار تھا جس کا ۱۸۳۷ء میں اجرا ہوا۔ مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر اس کے مدیر تھے اس اخبار میں سلیس رواں نثر میں خبریں اور واقعات درج ہوتے تھے۔ مثلاً ایک خبر حضور والا کے عنوان سے درجہ ہے-------

"جیون لال منشی صاحب کلال بہادر نے باریاب مجرا ہو کر کچھ کاغذات ملاحظہ
کروا کر ایک عورت کو سامنے کر کے عرض کی کہ یہ عورت کہتی ہے کہ میری بیٹی محل
حضور والا میں ہے۔ استماع فرما کے ایک خواج سر اہمراہ کر دیا کہ محل میں ہو تو فوراً
دلوادو۔ خواجہ سرا نے مع عورت کے محل میں بہت تلاش کی مگر اسی نہ پایا۔"[۲]

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ رنگین و مسجع نثر کے بجائے سادہ اور عام فہم نثر کا رواج ہو چکا تھا جو بعد

۱۔ ہندوستانی اخبار نویسی۔ محمد عتیق صدیقی، ص ۲۶۲

۲۔ ہندوستانی اخبار نویسی۔ محمد عتیق صدیقی

میں چل کر اردو صحافت کے منجھے ہوئے شستہ ورواں اسلوب کا نقطہ آغاز ثابت ہوا غالبؔ کو کوتوال شہر نے جوا کھلانے کے الزام میں گھر پر چھاپا مار کر گرفتار کیا تھا اور مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تھا جہاں انھیں سزا یاب ہونا پڑا تھا۔ اس واقعہ کو دہلی اردو اخبار نے مزا لے لے کر بیان کیا ہے۔ اس سے معاصرانہ چشمک کا اندازہ ہوتا ہے ۔اس خبر کی ہر سطر پر طنز و تعریض کا نشتر پوشیدہ ہے اور بعض پہلوؤں سے نہایت پست و رکیک ذہنیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس اخبار کے اندر معروضیت اور غیر جانبداری کا فقدان تھا۔

پروانہ رودولوی کا خیال ہے کہ دہلی اردو اخبار اردو صحافت کی شاہراہ پر اس لحاظ سے ایک سنگ میل ہے کہ اس نے جام جہاں نما کے بعد ایک چھلانگ لگائی اور -------

"رفتہ رفتہ اردو صحافت کا لہجہ بدلا اور زبان میں بھی نکھار پیدا ہوا۔ اردو اخبارات کی زبان اور لہجے میں جو تبدیلیاں آئیں ان کے نقیب اوّل مولوی محمد باقر تھے ۔ان کے اخبار میں جو خبریں یا مضامین شائع ہوتے تھے وہ ہندستان کے تمام گوشوں سے وقائع نگار ارسال کرتے تھے۔ اس انتظام سے اردو کی نثری خزانہ میں غیر محسوس طور پر زبردست اضافہ ہوا کیونکہ مختلف علاقوں کے محاورات 'اصطلاحات اور خاص خاص الفاظ بھی وقائع نگاروں کی رپورٹوں میں شامل ہوتے تھے۔ بہت سے محاورے یا اصطلاحات اور الفاظ جو علاقائی حدوں میں قید تھے اخبار کے صفحات پر جگہ پانے لگے اور ادب کی حصہ بنتے چلے گئے۔ اس طرح اردو صحافت نے اردو ادب کی نئی تشبیہوں اور نئی تمثیلوں سے مالامال کیا۔ غیر مروّج الفاظ کو ادب کا حصہ بنایا اور بہت سے مروّج الفاظ کا تو پیکر تبدیل کر دیا یا ان کو ادب سے بالکل خارج ہی کر دیا۔"[۱]

۱۔ اردو صحافت کا استغاثہ 'پروانہ رودولوی '۸۴۔۸۵

غرض جامہ جہاں نما کے بعد ۱۹۔۲۰ بدلوں کے عرصہ پر اردو نثر کی دنیا میں زبردست تغیر رونما ہوا اور دن بدن نثر صحافت کے ذریعہ سنورتی اور ترقی کرتی رہی۔ مولوی باقر نے اپنے اخبار کے ذریعہ تعلیم کے فروغ معاشرہ کی اصلاح، قومی وقار کے اظہار، سرکاری عملہ کی بدعنوانیوں پر تنقید، ڈاک کی بدانتظامی اور جرائم کی روک تھام میں عمل کی غفلت سے متعلق خبریں شائع کیں ساتھ ہی اعلیٰ درجہ کے ادبی مضامین بھی شائع کرتے رہے۔ انہوں نے خبروں کو اعلیٰ درجہ کی نثر کا رنگ روپ دینے کی بھرپور کوشش کی ان کی خبروں پر بھی داستان اور قصہ کا رنگ غالب ہے۔ وہ انقلابی مزاج کے انسان تھے اور ہر خبر پر اپنا تبصرہ بھی شامل کرتے تھے جو ادبی رنگ میں ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو:-

> "ممبئی کے اخبار سے پتہ چلتا ہے کہ اہل اسلام اور ہنود گبرو ترسا وغیرہ اقوام مختلفہ میں متفق ہو کر ایک عرض حضور گورنر میں گذاری ہے۔ مضمون اس کا یہ ہے کہ پادریان انگریزی بہ ترغیب و تحریض پارسی لڑکوں کو مذہب عیسوی میں لاتے ہیں اور ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ فرزندوں کو ہر قوم کے اپنے مذہب میں شامل کریں۔ التجا ہے کہ محکمہ گورنر حکم صادر ہو کہ بار دیگر کوئی پادری کسی مذہب کے بارے میں کچھ تلقین نہ کرے۔" ۱

مولانا امداد صابری لکھتے ہیں کہ:-

> "اس اخبار میں خاص طور پر دہلی کی سیاسی مجلس اور تمدنی زندگی پر روشنی ڈال جاتی تھی۔ ادبی مضامین بھی اس میں نظر آتے ہیں۔" ۲

۱۔ دہلی اردو اخبار، ۲۹/ مارچ ۱۸۴۱ء

۲۔ تاریخ صحافت جلد اول امداد صابری، ص ۱۲۶

خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:-

"سیاست سے قطع نظر دہلی اردو اخبار کی ادبی اہمیت بھی ہے۔اول تو یہ محمد باقر
اور محمد حسین آزاد اس کے دامن سے وابستہ تھے جن کی علمی حیثیت مسلم ہے
دوسرے غالب، ظفر، ذوق، غلام رسول ویران، میرزا انوار الدین، میرزا سلیمان شکوہ
، میرزا جیون بخت اور نواب زینب محل کے متعلق اس میں بے مثل مواد ملتا ہے۔"[۱]

دہلی اردو اخبار کی خبروں کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی انشائیہ پڑھ رہے ہیں ابھی پر تکلف نثر سے ہمارے اخبارات دامن چھڑا نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ اس اخبار پر بھی پر تکلف فارسی نثر کے اثرات نظر آتے ہیں۔ جملوں کی ساخت اور تراکیب فارسی کے زیر اثر ہیں لیکن محض عبارت آرائی کے بجائے اعلیٰ مقاصد کی ترسیل کو ہمیشہ سامنے رکھا جاتا ہے۔ مشکل و مغلق الفاظ کی کثرت ہے املا بھی قدیم ہے مثلاً اس کی جگہ اوس ،اکھاڑ کی جگہ اوکھاڑ وغیرہ لکھا گیا ہے۔اختصار کے بجاء تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ مبالغہ آرائی کا بھی سہارا لیا گیا ہے لیکن الفاظ کے گورکھ دھندے میں ہم الجھ کر نہیں رہ جاتے بلکہ مفہوم کی تہہ تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ مولوی باقر کی نثر میں طنز کا پہلو نمایاں ہے۔اسے ۔اس عہد کے انگریز حکام نے دریدہ دہنی سے تعبیر کیا اور اسے گندہ اخبار قرار دیا۔ڈاکٹر شہناز انجم کی یہ رائے صائب ہے کہ:-

"دہلی اردو اخبار کی نثر کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اسلوب جدید نثر کی
اولین مگر بہترین نمونوں میں شامل ہے۔ اس میں زندگی کی حرارت حسن روانی
اور بے ساختگی موجود ہے۔اس کے ساتھ سیاسی بیداری، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور ادبی

---

[۱] مقدمہ دہلی اخبار مرتبہ خواجہ احمد فاروقی ۱۹۷۲ء دہلی یونیورسٹی ،ص ۲۰

لطافت کی بھی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔اس اخبار سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحافتی اسلوب سے فارسی کا چولا اترا تو نہیں مگر اس کے بند ضرور ڈھیلے پڑنے لگے ہیں۔" ۱ے

دہلی سے ایک اخبار دوسرا اخبار سید الاخبار ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا جس کے مالک سر سید کے بھائی سید محمد تھے۔ان کے انتقال کے بعد خود سر سید نے کچھ دن اس کی نگرانی کی اور اسکے لئیمضامینلکھے اس اخبار میں بھی مضامین کا اسلوب کم و بیش دہلی اردو اخبار جیسا ہے،سر سید نے بعد میں تہذیب الاخلاق میں جو مقبول عام طرز تحریر اختیار کیا اس کی ابتدائی عشق سید الاخبار کے صفحات پر ہوتی ہے۔سر عبد القادر کی رائے ہے کہ -------

"سید احمد خاں نے سید الاخبار میں مضامین لکھ کر اپنی اخبار نویسی کی مستقل بنیاد رکھی۔" ۲ے

مرزا غالب بھی اس اخبار کے بڑے قدرداں تھے،ظاہر ہے کہ اس ممتاز اہل قلم کی قدردانی اور تحسین اس اخبار کی عمدہ عبارت اور اعلیٰ درجہ کے مضامین کی وجہ سے تھی۔اس طرح اردو کے ممتاز اہل قلم نے اس اخبار کے ذریعہ اردو صحافت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا صادق الاخبار جو ۱۸۴۴ء سے ۱۸۵۶ء تک مختلف افراد اور اداروں کی زیر ملکیت منظر عام پر آیا اردو صحافت کی دنیا میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔اس کا اسلوب بھی اپنے ہم عصر اخباروں جیسا ہے آگرہ سے مئی ۱۸۴۷ء سے اسعد الاخبار جاری ہوا۔اس اخبار کی ۲/مارچ ۱۸۴۹ء کی اشاعت پر مرزا غالب کی پنج آہنگ کی تقریظ میں ایک نظم درج ہے۔مرزا غالب کے بارے میں ۱۵/جولائی ۱۸۵۰ء کی ایک خبر سے اس اخبار کے اسلوب اور نثری مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:-

"ان دنوں شاہ دیں پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو یہ فرط

ا ے ادبی نثر کا ارتقا۔ڈاکٹر شہناز انجم۔نئی دہلی،ص ۳۲۶

۲ے بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۷۸

عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے
سلطنت حال تک ہو مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کی بالفعل پچاس روپیہ
مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا یقین ہے کہ تواریخ مذکورہ ایسی
دلچسپ ہو گی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیضیاب ہو گا۔"[۱]

اس عبارت پر قدامت کا اثر نظر آتا ہے اور محسوس ہو تا ہے کہ ابھی جدید نثر کی منزل دور ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے کی عشرہ پر دہلی و آگرہ والہ آباد سے اور اخبارات کا ذکر ملتا ہے جس میں زیادہ تر ادبی و شعری رنگ پایا جاتا ہے۔ مثلاً معیار الشعرا، صدر الاخبار، مطلع الاخبار، اخبار الحقائق، گورنمنٹ گزٹ، قطب الاخبار، مفتاح الاخبار،، کوہ نور، اخبار النواح، شملہ اخبار وغیرہ- کچھ اخبارات دیوناگری رسم الخط میں چھپتے تھے لیکن ان، کی زبان اردو تھی مثلا سدھا کر اخبار، بنارس اخبار وغیرہ ان میں اکثر اخبارات پر جو اودھ کے علاقہ سے شائع ہوتے تھے عبارت مقفٰی اور مسجع ہوتی تھی، ضعف ترصیع کا شوق غالب تھا۔ رنگین عبارت کو معاشرہ کی بالائی طبقہ میں مقبولیت حاصل تھی مثلاً "آفتاب ہند" جو بنارس کا ہفتہ وار اردو اخبار تھا اور جسے بابو کاشی داس مشرا نے ۱۸۵۲ء میں جاری کیا تھا اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

"ضمیر منیر دقیقہ شناسان صورت و معنی پر روشن ہو کہ دریں ولا واسطے فوائد
عوام اور بہبود سکنائے اس دیار کے ایک اخبار مسمّی بہ آفتاب ہند بہ زبان اردو تاریخ
غرّہ جنوری ۱۸۵۲ء سے شہر بنارس کے مطبع کاشی پریس میں خلعت طبع سے مرتب اور
حلیۂ حکمت و صنعت سے مزیب ہو تا ہے۔ امید کہ صاحبان ہنر اور دولت مندان

1- Famous Urdu Poets & Writers By Abdul Quadir page75

کرم گستر بنظر توجہ زلال اجابت سے اس نونہال گلشن خوبی کو حیات جاوید بخشیں اور
حال منظوری سے مطلع فرمادیں کہ ہفتہ بلاناغہ ارسال خدمت ہوا کرے۔"

اس عبارت پر عربی و فارسی کے اثرات نمایاں ہیں۔

لاہور سے ۱۸۵۰ میں کوہ نور منشی ہر سکھ رائے کی نگرانی میں شائع ہوا۔ یہ ہفتہ میں تین بار چھپتا تھا اس کی عبارت بھی رنگین اور پر شکوہ ہوتی ہے اور رجب علی بیگ سرور کا انداز تحریر جھلکتا ہے۔ والی بھرت پور سے متعلق ایک خبر اس اخبار میں جس فارسی آمیز اور مرصع زبان میں ہے ملاحظہ فرمائیے:۔

"ذکر فرحت اثر شادی تولد فرزند ارجمند مشکوئے دولت و اقبال جناب معلیٰ
القاب تریا بارگاہ رفیع پایگاہ، حاتم دوراں، نوشیر واں زماں جناب مہاراج صاحب بہادر
مہاراج برج اندر سوائی بلونت سنگھ بہادر والی بھرت پور بتقریب مبارکباد زیب صفحہ
اخبار ہوا تھا۔" [۱]

لیکن محمد عتیق صدیقی کے الفاظ میں یہ اخبار انتہا پسند اخبار تھا اور اسکی دوستی و دشمنی دونوں حد اعتدال سے نکل جایا کرتی تھی۔ انھوں نے کچھ ایسے اقتسابات پیش کئے ہیں جو کہ اس اخبر کی بد مذاقی بلکہ گالم گلوج کی سطح تک صحافت کو کھینچ لے جانے کا ثبوت ہیں۔

۱۸۵۴ء سے ٹیلی گراف کے تاروں کا نظام ملک میں قائم ہوا۔ سرکاری ڈاک کے آنے جانے کا نظام بھی مستحکم ہوا اور ۱۸۳۷ء میں اس محکمہ نے قطعی شکل اختیار کرلی اور آگرہ سے پشاور اور آگرہ سے بمبئ تک تار سے مربوط ہوگئے اس کا اثر اردو صحافت پر بھی ہوا۔ اب خبریں قطعی اور حقیقی واقعات پر مبنی ہونے لگیں اور ان کی تیز

۱- کوہ نور ۱۲؍ جولائی، ۱۸۰۱ء

رفتاری سے فراہمی کی سہولت پیدا ہوگئی۔ دوسرے اب اختصار اور سادگی کی طرف میلان پیدا ہونے لگا اور وضاہت وقطعیت کے ساتھ خبروں کو پیش کیا جانے لگا۔

۱۸۴۸ء میں مدراس سے بھی ایک اخبار "اعظم الاخبار" جاری ہوا۔ اس اخبار کے چندہ کا اشتہار میں پہلے صفحہ پر اس مقفّی عبارت میں درج ہوتا تھا۔

"اعظم الاخبار پنج شنبہ روز اشتہار، قیمت ایک روپیہ ماہوار پیشگی دس روپے سال میں ایک بار محصول ڈاک ذمہ خریدار" (۱)

اس اخبار میں اس عہد کے مذاق کے مطابق فارسی ترکیبوں کی بھرمار ہے۔

مدراس ہی سے ۱۸۴۹ء میں تیسیر الاخبار جاری ہوا جس کے مہتمم حکیم عبدالباسط عربی و فارسی کے علاوہ اردو سے انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اس اخبار کی خبروں کی عبارت قدرے پختہ اور رواں ہوتی تھی اور اس کا علمی معیار بلند تھا۔

لکھنؤ سے اس زمانہ میں "طلسم لکھنؤ" شائع ہوا۔ لکھنؤ کی سرخی کے تحت لکھنؤ کی مقفی عبارت آرائی کے جوہر دکھائے جاتے تھے اور عبارت بے حد رنگین ہوتی تھی لیکن محمد عتیق صدیقی کے الفاظ میں گردو پیش کے حالات اور تلخی روزگار کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ایک خبر ملاحظہ ہو:۔

"لکھنؤ میں سنیچر آیا ہے۔ چوروں نے ہنگامہ مچایا ہے۔ جو سانحہ ہے عجائب ہے ۔ آنکھ جھپکی پگڑی غائب ہے۔ جس دن سے سلطنت نہ رہی۔ شہر بگڑا چوروں کی بن آئی۔ کسی میں حالت نہ رہی اس اندھیر پر ایک مثل یاد آئی ہے کہ اندھے کی جورو کا

۱- اعظم الاخبار ۱۸۴۸ء

خدار کھوالا ہے۔اس نابینائی پر یہ حکومت اندھیر ہے صاف اندھے کے ہاتھ بٹیر

ہے۔" [1]

اس اخبار میں عہد کے آشوب وابتلا کی مکمل جھلک نظر آتی ہے۔ خبروں میں جذبات واحساسات کی حرارت شامل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خبر نویس جگ بیتی نہیں آپ بیتی لکھ رہا ہے واجد علی شاہ کی معذولی سے پورا اودھ متاثر تھا۔ خاص طور پر لکھنؤ والے بے حد اندوہ میں مبتلا تھے اس کا اندازہ طلسم لکھنؤ کو ان سطروں سے لگائیے :-

"زمانہ کی گردش نے عجب ویرانی دکھائی تمام خلقت کو رقت تھی۔ یہ حیرانی دیکھ کر حسرت تھی دیکھنے والوں کا دل کڑھتا تھا مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ایک دوسرے کا منھ تکتا تھا روتا بلکتا تھا۔" [2]

لکھنؤ سے ایک اور ہفتہ وار اخبار "سحر سامری" نومبر ۱۹۵۶ء سے جاری ہوا۔ مواد اور انداز بیاں دونوں پہلوؤں سے یہ اپنے عہد کے دیگر اخبارات کے مماثل۔ ایک اقتباس دسمبر ۱۸۵۶ء کے شمارے سے ملاحظہ ہو:-

"ان دنوں غلہ کی گرانی ہے۔ گرانی خاطر کی ارزانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہے کہ آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے فاقہ کشوں کی برق آہ شرربار سے خرمن ماہ جل گیا۔ گروہ نان خورشید لشکر غم کے پاؤں کے نیچے کچل گیا جو رفاقت سے رفاقت نہیں۔ ایک تو معاش نہیں جائے تلاش نہیں، دوسرے وفور غم سے گندمی رنگ ہر بشر نیلا ہوا گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا----" [3]

ہر ہر جملہ میں کوشش کی گئی کہ قافیہ کا لحاظ رکھا جائے۔ اس کے بغیر اس عہد میں بات منھ سے نکالنا محال

۱۔ طلسم لکھنؤ۔۱۶/جولائی، ۱۸۵۷ء

۲۔ طلسم لکھنؤ۔ ۲۵/دسمبر ۱۸۵۶ء ۳۔ سحر سامری لکھنؤ ۱۵/دسمبر ۱۸۵۶ء

نظر آتا ہے۔

دہلی میں ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج وجود میں آیا جس کا بنیادی مشن مغربی علوم اور مغربی خیالات کی اشاعت تھا اس کالج سے جو اخبارات و رسائل شائع ہوئے ان کے ذریعہ اردو صحافت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ۱۸۴۵ء میں قران السعدین ۱۸۴۵ء ہی میں فوائد الناظرین اور ۱۸۴۷ء میں محبّ ہند جاری کیا گیا۔ دہلی کالج میکالے کی تعلیمی نظریات کے تحت وجود میں آیا تھا جو ہندوستانیوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتا تھا جو

"رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر فکر و مذاق و دل و دماغ کے اعتبار سے انگریز ہو"

نور اللہ نایک اس صورت حال پر ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

"ہر وہ شخص جو انگریزی اسکولوں میں تعلیم پاتا ذہنی اعتبار سے اس کا رشتہ اپنے ہم وطنوں سے ٹوٹ جاتا چنانچہ انگریزی دانوں کا ایک الگ طبقہ بن گیا جن کو عوام الناس سے جو انگریزی سے نابلد تھے قطعاً ہمدردی نہ ہوتی اور یہی نہیں بلکہ وہ ان کے ساتھ کسی قسم کے تعلق کو بھی تسلیم کرنے سے منکر ہو جاتے"۔ ۱؎

دہلی کالج کے استاد رام چند اور ڈاکٹر چمن لال کے عیسائی ہونے کی خبر اخبار الحقائق میں ان الفاظ میں شائع ہوئی۔

"اس اتوار کو جب گرجیا گھنٹہ بجانے لگے تو ایک بڑی بھیڑ فوراً چاروں طرف سے دوڑی۔ پادری صاحب اتوار کی نماز پڑھتے پر بلڑ کے سبب تمام نہ کر سکے۔ اسی حالت میں باقی نماز کو چھوڑ دیا۔ اور حوض کے پاس جا کر مریدی خواہوں کو بلایا"۔

History of education in India Under the company Noorullah & Naik Page 203+

۱۸۴۵ء میں کالج سے قرآن السعدین کے نام سے ایک اخبار کا اجرا ہوا۔ اس باتصویر اخبار میں گارساں دی تاسی کے الفاظ میں سائنس ادب اور سیاست پر بحث ہوتی تھی۔ اس میں خبروں کے علاوہ نظمیں غزلیں قصیدے اور مضامین بھی چھپتے تھے۔ اس اخبار کے اندر ہوا کے بدلتے ہوئے رخ کے مطابق تحریر شائع ہوئی تھیں۔ اس کا اسلوب اور طریق اظہار ملک کے دیگر اخبارات سے مختلف ہوتا تھا، زبان سلیس رواں اور عام فہمی ہوتی تھی ۔رنگین و مقفّی عبارت کے بجائے فکر انگیز اور بلیغ عبارت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اشپر نگر جو دہلی کالج کے پرنسپل تھے لکھتے ہیں:-

"۱۸۴۵ء میں میں نے دہلی میں ایک باتصویر موقف رسالے کی بنیاد ڈالی اس کا نام قران السعدین تھا گویا مشرق و مغرب مشتری اور زہرہ تھے جن کا قران اس رسالے میں ہوا تھا۔ یہ اپنے قسم کی پہلی کوشش تھی ۔ گیارہ برس بعد جب میں ہندستان سے رخصت ہو تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکل رہے تھے۔ میرے نزدیک میری سعی کا یہ بہترین ثمرہ ہے کہ جن لوگوں کے نفع کے لئے میں نے جدوجہد کی ان کو اس سے ایسی تشویش ہوئی کہ وہ نمونے سے بہتر چیزیں بنانے لگے جوان کے لئے اور اس ملک کے لئے مفید ہوگی۔"

ماسٹر رام چندر نے بھی ۱۸۴۵ء میں اپنا رسالہ "فوائد الناظرین" جاری کیا۔ محمد عتیق صدیقی کا یہ قول سچ ہے کہ

"انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب لوگوں نے اپنی انتھک کوششوں سے زمین اردو کو آسمان کا ہم پلہ بنایا ان کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو ماسٹر رام چندر کا

نام سر فہرست ہو گا"۔ ؎

اس اخبار کی نثر سائنٹفک مضامین اور ہر طرح کے موضوعات کے لئے کار آمد ہے۔ کرۂ زمین کا حال جس طرح کی عبارت میں بیان کیا گیا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو نثر علی گڑھ تحریک کے عہد کی ترقی یافتہ شکل سے کسی قدر قریب پہنچ چکی تھی۔ ملاحظہ ہو:۔

"یہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ اہل فرنگ کی تحقیقات سے یہ بات بالکل تحقیق ہو چکی ہے کہ شکل زمین کی گول مثل نارنگی کے ہے۔ اہل فرنگ کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ زمین انیس کروڑ اڑسٹھ لاکھ سولہ ہزار چھ سو اٹھاون میل ہے اور زمین کے تین حصے کئے ہیں جن میں دو حصہ پانی اور ایک حصہ خشک زمین' ۲

فوائد الناظرین میں اس وقت ملک کے مختلف حصوں میں انگریزی کی مہم جوئی کی مفصل روداد نظر آتی ہے پنجاب میں سکھوں سے معرکہ اور بالآخر سکھوں کی شکست کے احوال درج ہیں۔ ہندوستانی قوم کو اوپر اٹھانے کا جذبہ جگہ جگہ جھلکتا ہے۔ ماسٹر رام چندر لکھتے ہیں:۔

"ایسے آدمی بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں کہ وہ دل و جان سے اپنے ملک کی بہبود چاہتے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں یہ نیکی نہیں پائی جاتی۔ یہاں کوئی اپنے ملک کے رفاہ کے لئے ہاتھ پیر نہیں ہلاتا اور جس کو دیکھو وہ یہی کہتا ہے کہ ہمارے لئے کیا ہوتا ہے۔" ۳

ماسٹر رام چندر نے ایک ماہوار رسالہ "محبّ ہند" ستمبر ۱۸۴۷ء سے جاری کیا اور اس میں بہ کثرت سائنسی

۱۔ ہندوستانی اخبار نویسی۔ محمد عتیق صدیقی۔ ص ۳۲۹

۲ ۔ فوائد الناظرین۔ تیسری جلد۔ ۲۳ نمبر ماہ نومبر ۱۸۴۸ بحوالہ دہلی کالج میگزین

۳۔ بحوالہ سجن لال۔ پروفیسر رام چندر۔ دلی کالج میگزین ص ۶۲

تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی وسیاسی مضامین شائع ہوئے اور قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اسی زمانہ میں دہلی کے زیر سایہ ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی تاکہ نئی نئی مغربی علوم کی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا جاسکے۔اس سے اردو اخبارات کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔اس سوسائٹی نے یہ اصول طے کیا کہ اگر سائنسی تاریخ یا دوسرے علم میں کسی مستند لفظ کا ترجمہ اردو میں نہ ملے تو اس لفظ کو اپنا لینا ہی مناسب ہے۔اگر دو مرکب الفاظ کا ترجمہ اردو میں نہیں ہے تو ایسے ہی زبان میں شامل کر لیا جائے۔اگر کسی مرکب انگریزی لفظ کا اردو میں مترادف نہیں بلکہ الگ الگ الفاظ میں میل کھاتے ہیں تو ان الفاظ کو ملا کر اپنا مطلب نکال لیا جائے جیسے ہاؤس آف کامنز سے دارالعوام۔مغالطے سے بچنے کے لئے بدیشی الفاظ کو چاہے ان کا مترادف موجود ہو زبان میں ملا لینا ہی زیادل مناسب ہے جیسے کلاس و آرڈر وغیرہ۔غرض اس اصول کے تحت بہت سے انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کو اردو میں داخل کر لیا گیا ہے اور اس طرز عمل سے صحافت کی زبان بھی مالا مال ہو گئی۔

غدر کے پہلے مذکورہ بالا تمام اخبارات کے اندر قوم کی بہبود کی فکر اور قومی غیرت موجود تھی اور اخبارات کے مضامین حب الوطنی کے جذبات سے سرشار تھے۔چنانچہ جب پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی لڑی گئی تو اردو اخبارات نے دیگر دیسی اخبارات سے زیادہ انقلابی رول ادا کیا چنانچہ لارڈ کیننگ اسی حقیقت کی طرف اپنے ۱۳ جون ۱۸۵۷ء کے بیان میں اشارہ کیا ہے:۔

> ”اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گذشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔یہ کام بڑی مستعدی چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا“:۔ [۱]

---

[۱] ہندوستانی اخبار نویسی۔محمد عتیق صدیقی ص ۳۵۷

اردو میں اخبار نویسی کی عمر ۱۸۵۷ء تک محض ربع صدی ہوئی تھی اور زیادہ تر اخبار سیدھے سادے اور محمد عتیق صدیقی کے الفاظ میں معصوم سے اصلاحی اخبار ہوتے تھے

"ان میں خبریں بھی ہوتی تھیں مگر بہ ظاہر غیر سیاسی قسم کی۔ لیکن ان کے انداز بیان سے انکے مواد کا اگر تجزیہ کیا جائے تو انکی گہرائی میں غم و غصہ کے دبے ہوئے طوفان نظر آئیں گے۔" [۱]

غدر کے ایام میں اردو اخبارات نے شورش و ہنگامہ اور مجاہدین آزادی کے کارناموں کو نمایاں طور پر پیش کیا اور اس وقت جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ نہایت عام فہم اور سلیس ہے۔ مختلف شہروں کی لوٹ مار اور تباہی و بربادی کا مفصل حال درج کیا گیا ہے۔ صرف ایک اخبار 'کوہ نور' انگریزوں کا وفادار ہے اور انگریزوں کی کامیابی کا مژدہ سناتا ہے۔ جنگ آزادی ختم ہونے اور انگریزوں کی کامرانی کے بعد باغی اخبار نویسوں کے ساتھ بڑا سخت سلوک کیا گیا۔ دہلی اردو اخبار کے مدیر مولوی باقر کو گولی مار دی گئی۔ محمد حسین آزاد نے اپنی جان کسی طرح بچائی۔ صادق الاخبار کے اڈیٹر کو بھی قید کی سزا دی گئی۔ گلشن نو بہار کو چھاپہ خانہ ضبط کر لیا گیا۔

ڈاکٹر شہناز انجم غدر ۱۸۵۷ء تک کی نثر کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"۱۸۵۷ء تک کے اخبارات و رسائل کی نثر کے تجزیے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نثر کی وہ ادبی روایت جس کی ابتدا مذہبی قصوں کہانیوں اور داستانوں کے ذریعہ ہوئی تھی اور خطوط نویسی کے ذریعہ جس کو مزید تحریک ملی تھی وہ صحافت کے ذریعہ اور شگفتہ اور ناتواں ہو گئی۔ پریس کی ترقی اور اخبارات کی اشاعت نے نثر کی اس

۱۔ ہندوستانی اخبار نویسی۔ محمد عتیق صدیقی ص ۳۶۰

روایت کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچادیا۔ صحافتی اسلوب اور ادبی اسلوب بظاہر ایک دوسرے سے علٰحدہ سہی مگر متضاد نہیں، متوازی ہیں اس لئے بنیادی طور پر ادبی نثر صحافتی رنگ میں بھی ظاہر ہوئی۔ مگر اس کا یہ اسلوب زمانے کے تقاضوں اور موضوع کی مناسبت سے سادگی اور سلاست کی طرف مائل ہے۔ افسانے وافسوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اس دور کی نثر پر نئے دور کی آمد اور ترقیوں کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ اسلوب میں شادابی و بے تکلفی کے ساتھ وسعت بیان وضاحت سادگی اور ترسیلی قوت بھی پیدا ہوگئی تھی۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ اردو کی ادبی نثر کے ارتقا پر صحافت کا خوشگوار اثر پڑا۔" [1]

غرض ہماری اردو نثر صحافت کے سہارے دیگر اصناف ادب کے بالمقابل نشو ونما کے لا محدود امکانات سے اولین جنگ آزادی تک ہمکنار ہوئی اور جب انگریزی اقتدار کے ساتھ مغربی فکر و خیال اور سائنسی انکشاف کی وجہ سے زندگی و ادب کو غیر معمولی تغیرات سے دوچار ہونا پڑا تو اردو صحافت انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنے توانا اسلوب کی مدد سے بھرپور راہنمائی کی۔

---

[1] ادبی نثر کا ارتقا۔ ڈاکٹر شہناز انجم ص ۳۵۷

باب دوم

اردو صحافت

۱۸۵۷ء (تہذیب الاخلاق) سے ۱۹۰۰ء تک
(اسالیب اظہار کے تناظر میں)

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اردو صحافت زبردست آزمائش کے مراحل سے دوچار ہو گئی۔ اردو بولنے والی آبادی بالخصوص مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ انگریزوں نے سخت انتقام لیا۔ اردو صحافت کا سارا تانا بانا بکھر گیا۔ اس عہد میں انگریزوں کے چاپلوس انگریزی اخبارات نے آتش انتقام کو اور زیادہ بھڑکانے کی کوشش کی۔ غیر ملکی حکمرانوں کی دارو گیر اور ظلم و ستم کے نتیجہ میں زیادہ تر اردو اخبارات بند ہو گئے۔ نٹراجن کے الفاظ میں......

"۱۸۵۳ء میں اردو زبان کے اخبارات کی تعداد ۳۵ تھی۔ ۱۸۵۸ء کی فہرست میں صرف ۱۲ اخبار رہ گئے۔ ان چھ پہلے اخبار تھے اور چھ نئے۔ ان بارہ اخباروں میں صرف ایک اخبار کی ادارت ایک مسلمان کے ہاتھ میں تھی۔ ان میں سے کئی اخبارات کو اپنی پالیسی میں زبردست تبدیلی کرنی پڑی۔ اردو ادب کے مراکز لکھنؤ، دہلی، میرٹھ اور کانپور جنگ آزادی کی ہولناکیاں بہت قریب سے دیکھ چکے تھے اور ان میں سیاسی صحافت کا یارا نہیں تھا۔ کلکتہ میں انگریزی اور بنگالی نے فارسی اور اردو کو نکال باہر کیا تھا۔"(۱)

۱۸۵۷ء سے پہلے اردو کے اخبارات کی پر ادب اور شعر کا رنگ غالب تھا۔ نثر پر بھی نظم کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ رنگین عبارتوں کو مقبولیت حاصل تھی۔ بقول ڈاکٹر مسکین علی حجازی :

"۱۸۵۷ء سے پہلے کی اردو صحافت زبان اور اسلوب کے لحاظ سے ادب سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ خبروں کی تک میں زبان خالصتاً ادبی ہوتی تھی۔"(۲)

۱- A History of Press in India - Asia Publishing House, India Page : 54

۲- پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ - ڈاکٹر مسکین علی حجازی - سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۱۷

انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو اخبارات اور جراید کو آداب صحافت کا شعور تھا اور وہ جا و بے جا تعریف اور اقتدار وقت کی تائید یا دوسروں کی پگڑی اچھالنا یا اپنے حریفوں پر کیچڑ ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ معاصرانہ چشمک اور تیز و بند لب و لہجہ میں گفتگو صحافت کے اسلوب کے لئے موزوں نہیں تصور کی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں شائع ہونے والے اخبار مخبر دکن نے اسی عہد کے ایک اخبار "جریدۂ روزگار" کو جو جاو بے جا سلطنت آصفیہ کی تعریف کرتا تھا، آداب صحافت کی تلقین کرتے ہوئے لکھا :

"ایڈیٹری اس کا نام نہیں کہ جھوٹی خوشامد کی جائے اور بے جا تعریفوں کے پل باندھے جائیں جیسا کہ اخبار جریدۂ روزگار کا مشرب ہے۔ ہمارا بد خواہ سلطنت بننا صاحب جریدہ نے صرف اس بنا پر ٹھہرایا کہ ہم نے چند عہدیداران سرکار نظام کی بعض بے جا کارروائیوں پر اعتراض کیا۔ ذرا کوئی اس پیر مغاں سے پوچھے کہ آپ کا ارشاد یورپ والوں کی نسبت کیا ہوتا ہے کیونکہ یہی مشغل ان کی رگ و پے میں جاری ہے اور یہی شوق انہیں دن رات لگا رہتا ہے۔ دیکھئے کوئی روز ایسا بھی گزرتا ہے جب کہ کسی نہ کسی ایڈیٹر سے کسی لارڈ یا ڈیوک کی کارروائی کی نکتہ چینی نہ کی ہو۔"(۱)

مذکورہ بالا مبصر کی یہ رائے درست ہے کہ

"اگرچہ انیسویں صدی میں سیاسی مذاق متعین نہیں ہوا تھا اور سیاسی بیداری بہت کم تھی تاہم اس زمانے میں اخباروں نے ہر ممکن طریقہ سے کام لیتے ہوئے کوشش کی کہ وہ جمہوریت کا آلہ کار نہیں اور اپنے فرائض منصبی ادا کریں۔"(۲)

۱- بحوالہ کاروان صحافت۔ عبدالسلام خورشید۔ کراچی ص ۸۷۔

۱- بحوالہ کاروان صحافت۔ عبدالسلام خورشید۔ کراچی ص ۸۸۔

صحافت کی آزادی بر قرار رکھنے کا اس عہد میں ہر طرف سے مطالبہ کیا جانے لگا تھا اور خوشامدانہ لب و لہجہ میں بات کرنے والوں کو ناپسند کیا جاتا تھا۔ ''مخبر دکن'' نے مطالبہ کیا تھا :

''اگر اخباروں کو آزادی عنایت نہ کی جائے تو جو فائدے اب اخباروں کی بدولت سرکار و رعایا کو حاصل ہیں وہ ہرگز حاصل نہ ہوں گے۔ اخباروں سے عدم آزادی میں کیا توقع ہو سکتی ہے۔ یہی کہ سچی باتوں کا اخفا جائز رکھا گیا۔ سارا اخبار خوشامد سے بھرا ہوا ہے۔ کام کی بات ایک نہ لکھی گئی۔ ہزاروں ظلم رعایا پر اور لاکھوں سازشیں رعایا سے عمل میں آئیں مگر اخبار نویس نے ان کو ایسا ظاہر کیا کہ ظلم کو عدل اور سازشوں کو قومی ہمدردی کے جلسے بتلادیا...... ''(۱)

انیسویں صدی کے آخری عشروں میں بد قسمتی سے سرسید کی مخالفت میں کئی اخبارات نے گالی گلوج کو اپنا شعار بنالیا۔ ''اودھ پنچ'' نے تو کسی حد تک تہذیب کلام کا مزاح کے اندر بھی لحاظ رکھا لیکن کئی اور مزاحیہ اخبار جو پنچ کی تقلید میں نکلے وہ ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے کا ذریعہ بن گئے اور عبد السلام خورشید کے الفاظ میں ان سے صحافتی اقدار کو ضعف پہنچا اور اسلوب و انداز بیان کے اعتبار سے بھی انہوں نے صحافت کو معیار پست بنایا۔ سید ضیاء اللہ صحافت کے اسلوب اور نثر کی خوبیوں پر رقمطراز ہیں :

''صحیفہ نگاری میں کلام کی سلاست و روانی کو برتری حاصل ہے۔ کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال ضروری ہے جو اہل زبان بولتے ہیں۔ کلام میں انوکھی ترکیبیں ثقیل، بھدے، غیر مانوس، مغلق خلاف محاورہ الفاظ و مرکبات نہ ہو۔ لفظوں اور محاوروں کو

۱- بحوالہ کاروان صحافت۔ عبد السلام خورشید۔ کراچی ص ۸۹۔

اس طرح استعمال کیا جائے جس طرح اہل زبان بولتے یا لکھتے ہیں۔ تحریر ایسی ہو کہ موقع و محل کے تقاضے اس سے پورے ہوں، الفاظ عام فہم ہوں۔ صحافت میں وضاحت و بلاغت کا مقصد یہ ہے کہ کسی واقعے خیال یا کیفیت کی صحیح لفظی تصویر کھنچ جائے، مخاطب کا ذہن صحیفہ نگار کے مافی الضمیر تک پہنچ جائے۔ اظہار مطلب کے لئے کم سے کم الفاظ کا استعمال ہو۔ صحافت میں شاعرانہ فصاحت و بلاغت اور صنائع بدائع کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اخبارات کا قاری کم سے کم الفاظ میں صحیح عکاسی چاہتا ہے۔ شاعرانہ گلفشانیاں اور نزاکت بیان برداشت نہیں کر سکتا۔"(۱)

سید ضیاء اللہ صحافتی زبان کی خوبیوں کا مزید جائزہ لیتے ہیں :

"صحافتی زبان کے اپنے تقاضے ہیں، مثال کے طور پر ہم فلسفہ اور سائنس کے مسائل کو دلی کی بیگماتی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کریں تو اس کا نتیجہ مضحکہ خیز ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی اخبار میں خالص علمی زبان کا استعمال ہونے لگے تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ کچھ ہی دنوں میں اس اخبار کی مقبولیت کا دائرہ انتہائی محدود ہو کر رہ جائے گا۔"(۲)

سید ضیاء اللہ کا یہ خیال درست ہے کہ ہر شعبے کی زبان اپنے ہدفی سامعین (ٹارگٹ آڈی ینس) کی ضروریات اور علمی استطاعت کے مطابق ڈھالی جاتی ہے۔ لہٰذا صحافت کی زبان بھی اسی اصول کی پابند ہے۔(۳)

۱- اردو صحافت ترجمہ و ادارت۔ سید ضیاء اللہ کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور ۱۹۹۴ء ص ۳۰۔

۲- اسلوبیاتی مطالعہ۔ پروفیسر منظر عباس نقوی۔ علی گڑھ ۱۹۸۹ء ص ۱۵۔

۳- اردو صحافت ترجمہ و ادارت۔ سید ضیاء اللہ، بنگلور ۱۹۹۴ء ص ۲۰۔

بحیثیت مجموعی ہم اپنے صحافتی سرمایہ کا جائزہ لیں تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے انیسویں صدی کے نصف آخر تک اردو صحافت میں غیر معمولی انقلاب آیا۔ پہلی جنگ آزادی سے پہلے اردو صحافت کا حلقہ نہایت محدود تھا اور اس کے مخاطب طبقۂ امرا کے لوگ تھے۔ عوام کی ترجمانی اس میں بہت کم ہوتی تھی۔ زیادہ تر حکومت کی خوشامد کا لب و لہجہ اخبارات میں پایا جاتا تھا۔ خبریں دیگر زبانوں کے اخبارات سے نقل کی جاتی تھیں اور ان کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ سر سید احمد خان نے صحافت کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ اردو ادب اور شاعری کی طرح صحافت کو بھی بامقصد بنایا۔ انہوں نے اقتدار وقت کی چاپلوسی و خوشامد کے بجائے اس کے اچھے پہلوؤں کی تحسین اور برے پہلوؤں پر تنقید کا رویہ اپنایا۔ سر سید کی علی گڑھ تحریک کے نتیجہ میں اردو شعر و ادب اور اردو زبان میں زبردست تغیرات رونما ہوئے۔ سیاسی و تعلیمی بیداری پیدا ہوئی۔ اصلاحی رجحان نمودار ہوا۔ فضول اور لغو و بے مقصد کاموں سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ سر سید احمد خاں کے متوازی اردو میں مزاحیہ و ظریفانہ صحافت بھی فروغ پذیر ہوئی۔ یہ سر سید کی غیر معمولی متین سنجیدہ اور عقلیت پرستانہ رجحان کا رد عمل تھا۔ اس کا ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ غدر کے بعد کے مایوس کن احوال میں اس نے زندگی اور زندہ دلی کا ثبوت دیا اور مایوسی کے بجائے شادابی و شوخی کی چنگاریاں پیدا کیں۔ انیسویں صدی کے آخری ادوار میں صحافت اعلیٰ مقاصد سے ہٹ کر کاروباری انداز بھی اختیار کرنے لگی۔

اسی عہد میں قدیم مشکل پسندی، مقفیٰ و مسجع عبارتوں کا التزام اور فارسی و عربی سے مرعوبیت کا رجحان ختم ہوا۔ بقول ڈاکٹر مسکین علی حجازی :

> "پیسہ اخبار اور اخبار عام وغیرہ نے اردو صحافت کو ادب سے الگ کرنے اور صحافت میں روزانہ اخبارات کو غالب کرنے کے سلسلہ میں نمایاں کام کیا۔ اردو

صحافت کی زبان کو بھی اخباری زبان بنانے کی کوشش کی۔"(۱)

تہذیب الاخلاق

سر سید احمد خاں نے ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو اردو زبان کا ممتاز ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ یہ رسالہ اگرچہ بنیادی طور پر اصلاحی مقاصد کے تحت جاری کیا گیا تھا لیکن اس نے اردو نثر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا اور ہم عصر صحافت کو بھی اسلوب اور طرز ادا کے معاملہ میں روشنی دکھائی۔ اس رسالہ کے ذریعہ ہر معاملہ میں عقلی اور تنقیدی انداز فکر اختیار کیا گیا۔ خالدہ ادیب خانم نے سچ لکھا ہے کہ :

> "سر سید کو کسی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے بڑے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہے۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں خواہ ان کی سمت ہمیشہ وہ نہ رہی ہو جو سر سید پسند کرتے تھے۔"(۲)

خواجہ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ

> "سر سید احمد خاں کے اخبارات کے بعد جاری ہونے والے اخبارات سے موازنہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اردو اخبارات نے ان پرچوں سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔"(۳)

۱- پاکستان و ہند میں مسلم صحافت۔ مسکین علی حجازی ص ۴۰۔

۲- Inside India - Khalida Khanam Adeb

بحوالہ پاکستان و ہند میں مسلم صحافت۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی ص ۲۰

۳- پاکستان و ہند میں مسلم صحافت۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی ص ۲۰

اس میں شک نہیں کہ سر سید کے ان اخبارات نے اردو زبان کی غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ سر سید کی جماعت کے سامنے ایک منزل مقصود تھی۔ وہ کچھ معین خیالات رکھتے تھے جسے دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ قدیم انداز نگارش کے قائل نہ تھے جس کا مقصد محض لفظی بازیگری اور ذہنی عیاشی تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس سے پہلے صحافت شاعرانہ انداز رکھتی اور غور و فکر کے بجائے رومانیت اور جذباتیت کے دھندلکوں میں لے جاتی تھی۔ دنیا کے مختلف علوم سے اس کا رشتہ کٹا ہوا تھا اور اردو صحافت ٹھٹھر کر رہ گئی تھی۔

بقول ڈاکٹر مسکین علی حجازی :

> "سر سید نے صحافت میں علم کا پیوند لگایا۔ ان کے ساتھ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاءاللہ دہلی، مولانا نذیر احمد، علامہ شبلی، مولانا حالی اور بہت سے دوسرے زعما بھی تھے جو نہ صرف مضامین و مقالات کے ذریعہ براہ راست بلکہ الگ الگ طور پر ان علمی و ادبی تخلیقات کے ذریعہ بالواسطہ طور پر بھی اردو صحافت و ادب کی اصلاح میں شریک تھے۔ ان کی تحریروں میں سادگی، متانت اور جامعیت کے عناصر ملتے ہیں اور یہی عناصر دور سر سید کی صحفات اور ادب کے بنیادی عناصر ہیں۔ اگرچہ بعض نقادوں کی رائے سر سید احمد خاں کی زبان ادبی چاشنی سے محروم ہے اور انگریزی الفاظ کے استعمال نے اسے عجیب و غریب بنادیا ہے مگر ان کی تحریر کا یہ عیب تحریر کی خوبیوں کے مقابلہ میں وزنی نظر آتا ہے۔" (۱)

سر سید نے اس رسالہ کے آخری سال میں اپنی صحافتی زبان کی خوبیاں بیان کی ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔ اور

۱- پاکستان و ہند میں مسلم صحافت۔ مسکین حجازی۔ ص ۲۱

یہی وہ سانچہ تھا جس میں اردو نثر آئندہ سو سال تک ڈھلتی رہی اور اس نے رنگین مقفیٰ اور خیالی نثر اور داستانی و شاعرانہ انداز بیان پر خط نسخ پھیر دیا۔ سر سید رقمطراز ہیں :

> ''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے پرچوں کے ذریعہ کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگین عبارت جو تشبیہات اور مضامین خیالی سے بھری ہوی ہے اور اس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے کہ وہ اس زمانہ میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی، ہاتھ اٹھایا اور جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی......''(۱)

اودھ پنچ

اردو صحافت کی تاریخ کا یہ دلچسپ باب ہے کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں جب کہ علیگڑھ تحریک کے زیر اثر اردو صحافت میں سنجیدگی گہرائی اور فکر و نظر کی بلندی پیدا ہو رہی تھی اسی زمانہ میں لکھنوٴ قہقہہ زار بنا ہوا تھا اور اس سر زمین سے ایک ایسا اخبار جاری ہوا جس نے اپنی الگ راہ بنائی اور سر سید و علیگڑھ تحریک کے مدمقابل اپنا ایک الگ دبستان صحافت بنایا جس کی بنیاد مزاح اور ظرافت پر تھی اور کبھی کبھی غیر سنجیدگی اس پر اس قدر غالب ہو جاتی تھی کہ یہ سر سید کی ساری کوششوں پر پانی پھیرنے پر کمربستہ ہو جاتا تھا۔ اس سے پہلے انگلستان میں اس طرح کے مزاحیہ اخباروں کا چلن عام ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں بھی ۱۸۵۹ء میں مدراس سے ''مدراس پنچ'' کا اجرا

۱- تہذیب الاخلاق۔ سر سید احمد خاں علیگڑھ ۱۸۹۱ء

ہوا۔ ۱۸۷۹ء میں روہیلکھنڈ پنچ جاری ہوا۔ اسی سال بہار سے بہار پنچ جاری ہوا۔ جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے اودھ پنچ منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین تھے جو ایک زبردست نثر نگار تھے۔ اس اخبار کے ممتاز قلمکاروں میں مرزا مچھو بیگ، ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق، احمد علی کسمنڈی اور اکبر الٰہ آبادی شامل ہیں۔ اس اخبار کے سرورق پر ایک کارٹون ہوتا تھا۔ اس میں مضامین، نظمیں اور خبریں اور کارٹون ہوتے تھے۔ اس اخبار نے بے باکانہ صحافت کی روایت شروع کی۔ یہ مغربی تہذیب کا سخت مخالف تھا اور سرسید کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتا تھا اور مزاحیہ انداز میں ان پر تنقید کی جاتی تھی۔ انگریزوں کی پالیسیوں اور ان کے امتیازی برتاؤ اور ملازمتوں کے معاملہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ رویہ پر طنز کیا جاتا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

> "دیسی بوجہ ناقص طریقہ تعلیم سرکاری انیس سال کے سن تک سول سروس کا امتحان دینے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اس سول سروس کے میوے کو ہندوستان کی آب و ہوا موافق نہیں۔ لہٰذا یہ ولایتیوں کے لئے مخصوص ہے۔ چونکہ دیسیوں کا سر کم وزن ہوتا ہے اور کم وزن و چھوٹا سر حماقت کی نشانی ہے لہٰذا دیسی احمق ہیں۔ اس واسطے دیسیوں کی رائے قابلہ مضحکہ ہے اور مضحکہ چونکہ ذلیل کرتا ہے لہٰذا دیسی ذلیل ہوگئے......"(۱)

اس اخبار کے اثرات بھی معاصر اردو صحافت پر گہرے مترتب ہوئے۔ لوگ سیاسی امور اور معاشرتی مسائل پر کھل کر تنقید کرنے لگے۔ جگہ جگہ سے پنچ اخبار جاری ہوئے۔ مثلاً سرپنچ ہند لکھنؤ، پنچاب پنچ لاہور، کلکتہ

۱- اودھ پنچ، لکھنؤ ۲۸؍اگست ۱۸۷۷ء

پنچ، بنارس پنچ، ہریانہ پنچ، کرناٹک پنچ، جالندھر پنچ وغیرہ .... ریاض خیر آبادی نے اپنا اخبار "فتنہ" ۸ر جولائی ۱۸۸۲ء سے گورکھپور سے جاری کیا۔ یہ اسم بامسمیٰ تھا۔ تیزی و طراری میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اودھ پنچ کے زبان وادب پر اثرات کا اعتراف کرتے ہوئے چکبست لکھنوی لکھتے ہیں :

"اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اتار کر جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے کچھ نہ تھا ایسے پھولوں سے آراستہ کیا جس میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا۔" (۱)

لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے کہ ......"اودھ پنچ کی ظرافت بڑی حد تک ادبی عناصر سے تہی اور سستی قسم کے ہزل اور پھکڑپن سے زیادہ قریب ہے۔"(۲)

اودھ پنچ میں منشی سجاد حسین نے سحر بیان اور جادو نگار قلم کار جمع کر لئے تھے۔ وہ نظام معاشرت میں قدامت پرستی کے قائل تھے اور مغربی تہذیب کے دشمن تھے۔ ۱۸۸۷ء میں نیشنل کانگریس میں شریک ہوئے اور مرتے دم اپنے اخبار سے اس کی حمایت کرتے رہے۔ آخری دور پریشانیوں میں گزرا لیکن ان کا قلم نہیں تھکا اور وہ علالت کے باوجود ۱۹۱۲ء تک اودھ پنچ نکالتے رہے۔

"سجاد حسین لکھنؤ کی زبان کے استاد تھے۔ مذہبی تعصب سے اپنا دامن پاک رکھا۔ ان کی صحافت کا بنیادی اصول آزادی اور ایمانداری تھا۔ انہوں نے جو وضع اختیار کرلی مرتے دم تک اسے نبھایا۔"(۳)

۲- مضامین چکبست۔ چکبست لکھنوی

۲- اردو ادب میں طنز و مزاح۔ وزیر آغا ص ۱۴۹

۳- مقدمہ انتخاب اودھ پنچ۔ رضی کاظمی۔ کتابی دنیا، لکھنؤ ۱۹۹۴ء

شوخی و بذلہ سنجی منشی سجاد کے خمیر میں داخل تھی اور انہوں نے اردو صحافت کو اس عنصر سے چار چاند لگادیا۔ معمولی معمولی موضوعات میں وہ بذلہ سنجی کا پہلو پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک شمارے میں

> "پیارے کارسپانڈنٹ کا پیارا خط پیارے سالے کے نام" کے عنوان سے مشورہ دیتے ہیں کہ شادی کی جلدی نہیں کرنی چاہئے ...... "میں تو کبھی ہندوستان کی اس رسم کو پسند نہیں کرتا کہ بھوجن ہو نہ ہو مگر وہ ہو۔" (۱)

سجاد صاحب سیاست کے میدان کے بھی مرد ہیں اور حریفوں سے پنجہ آزمائی کرنے کا آرٹ خوب جانتے ہیں۔ ۳/دسمبر ۱۸۹۹ء کو لکھنؤ میں کانگریس کے جلسۂ عام کے مخالفین کی خبر اس طرح لیتے ہیں۔ عنوان ہے "انڈے بچے والی چیل چلہار" ....

> "بھلا یہ کیونکر ممکن ہو کہ بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکے۔ چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی انٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نمو ہی بنی منہ میں گھگھیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی توبہ کیجئے بولیں اور بیچ کھیت بولیں بلکہ گلا پھاڑ کے غل مچا کے سارا شہر سر پر اٹھا کے جس میں یہاں سے لندن تک تو خبر ہو جائے کہ لکھنؤ میں بھی کچھ انٹی بھائی ہیں۔ جب دیکھا کہ کانگری کا اجلاس سر پر آپہنچا۔ ادھر لفٹنٹ گورنر بہادر بھی شہر میں تشریف فرما ہیں ادھر حضور وائسرائے بھی عنقریب دربار فرمانے والے ہیں، چھتری سرکس بھی تماشے کر کر رہا ہے۔ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی بھی آئی ہے ان لوگوں کو بھی مثل عارضہ

۱- انتخاب اودھ پنچ۔ رضی کاظمی۔ کتابی دنیا، لکھنؤ ۱۹۹۴ء ص ۱۳

متعدی نچ نچی چھوٹی۔ عظیم الشان جلسہ انٹی کانگریس کا اشتہار دے ہی دیا۔"

اس تبصرہ کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے ؎

ساتھ لے کے اپنے یاروں کو مینڈکی بھی چلی مداروں کو

منشی سجاد حسین اودھ پنچ میں دنیا کی مشہور سیاسی شخصیتوں کے نام خطوط بھی شائع کرتے ہیں اور کبھی کبھی خود ان کے نام سے لکھے گئے خطوط بھی ترتیب دیتے ہیں جو طنز و مزاح سے بھرپور ہوتے ہیں۔ یہ مزاح کبھی کبھی سوقیانہ انداز ضرور اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں لکھنؤ کے امراء اور رؤساء کے ایک حلقہ کی پست مذاقی کو دخل ہے جو اس اخبار کے شائق تھے۔

انگلینڈ کے وزیر خارجہ گلیڈ سٹن کے نام ایک خط میں سجاد حسین لکھتے ہیں :

"مولوی گلیڈ سٹن صاحب طول عمرہٗ دعائے خیر نصیب شماباد۔ ایسے زمانے میں جب کہ چاروں طرف سے ہوائے شر و فساد ہر ملک سے سموم بغض و عناد کے جھونکے آرہے ہیں تمہارے حق میں اس سے بڑھ کر مناسب دنیا میں شاید ہی کوئی دعا ہوگی۔ میں نے تمہاری فارن پالیسی کبھی لائق ستائش نہیں پائی۔ رفاہ و فلاح، آرائش و زیبائش ظاہر ٹیم ٹام اور پری لیس پوت کے واسطے تمہاری ذات مخصوص ہے مگر اس کے لوازم اور مصالحوں کی فراہمی اور ترکیب سے تم ایسے محروم جیسے ہندوستانی جودت سے۔ تم پولیٹکل دستر خوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار ہو۔ تم نے جو کچھ کسی قوم یا معاملے کی نسبت رائے قائم کی وہ اکثر غلط نکلی" (۱)

۱- انتخاب اودھ پنچ۔ ص ۳۴

ملکہ وکٹوریہ کے نام مدیر اودھ پنچ کے خط کی زبان کا لطف ملاحظہ کیجئے :

"سلطنت ایک ٹرین ہے جس کا انجن پارلیمنٹ۔ حیات و ممات، صحت و عارضہ، ترقی و تنزلی چولی دامن کا ساتھ رکھتے ہیں۔ تمہاری قوم تہذیب و ترقی کے درجہ کو طئے کر چکی ہے اب اس کو نبھانا چاہئے اور بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا لازمی ہے۔ سارا یورپ اپنے واسطے ایک طوفان عظیم بنا رہا ہے۔"(۱)

مہاراجہ کشمیر کے نام، نظام دکن کے نام، بیگم بھوپال کے نام بھی خطوط ہیں۔ ان خطوط میں مزاحیہ پیرایہ میں ان حکمرانوں کے اچھے پہلوؤں کے ساتھ ان کی خرابیوں اور عوام کے لئے باعث پریشانی امور کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو وارننگ دیتے نظر آتے ہیں۔

ایک مقام پر مغربی تہذیب اور اپنے مشرقی تمدن کا ذکر نواب سید محمد آزاد کے نام پرانی روشنی کا نام و پیام کے عنوان سے کرتے ہیں ....

"آپ تو جانتے ہیں ہم پورانے اسکول کے آدمی ہیں اور ہمارے دل میں قدیم مدرسہ اور اس کے علوم و فنون اور پورانے خیالات کا گنجینہ ہے۔ ہم اپنی وضع قطع کے پیار کرنے والے ہیں۔ یہ تو بہر پیوں کا کام ہے کہ روز ایک نیا روپ لاتے ہیں اور اس کے ذریعہ اپنی روٹی کماتے ہیں۔" (۲)

منشی سجاد حسین مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں پر آفریں بھی کہتے ہیں اور اپنی روشن خیالی کا ثبوت بھی

۱- انتخاب اودھ پنچ۔ ص ۴۲

۲- انتخاب اودھ پنچ۔ ص ۷۷

کبھی کبھی دیتے ہیں :

"یہاں کے لوگ آزادی کے عاشق ہیں اور نقش آزادی گویا ان کے سینوں پر کندہ ہے۔ ان کو دولت و حشمت اور ریاست کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے مگر جہاں کسی نے ان کی آزادی کو انگلی دکھائی خون بہانے کو موجود .... آزادی کی ترنگ میں اپنے سب قسم کے حقوق عورتوں کے ساتھ بانٹ لیا ہے اور مرد عورت کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہے............" (۱)

منشی سجاد کبھی کبھی نہایت مرصع زبان میں انشائیے تحریر کرتے ہیں۔ ہندوستانی بی بی یعنی خاتون مشرق کا نہایت مرصع زبان میں خاکہ کھینچتے ہیں۔ پھر ایک شمارہ میں جدید اور روشن خیال بیوی کا خاکہ اڑاتے ہیں۔ رتن ناتھ سرشار بھی اس اخبار میں خوب خوب گل کھلاتے ہیں اور طنز و مزاح کے پیرایہ میں بین الاقوامی واقعات پر اظہار کرتے ہیں۔ تربھون ناتھ ہجر، احمد علی شوق، مچھو بیگ، ستم ظریف، جوالا پرشاد برق نظم و نثر میں اپنے قلم کا جوہر دکھاتے ہیں۔ مگر اودھ پنچ نے صحافیانہ اسلوب کو مانجھنے اور فنی اعتبار سے ادبی صحافت کو فروغ دینے میں اپنے معاصر جرائد کی طرح بہت زیادہ قابل ذکر خدمات انجام نہیں دیں۔

عبدالحلیم شرر - (مہذب اور دلگداز کی روشنی میں)

اردو صحافت کی تاریخ میں عبدالحلیم شرر کو بھی اپنے اسلوب بیان کے ندرت و دلکش، موضوعات کی رنگارنگی اور سلاست زبان کے اعتبار سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کا صحافتی شاہکار ہفتہ روزہ "مہذب" تھا، جو یکم اگست ۱۸۹۰ء کو منظر عام پر آیا۔ اس اخبار کے مقاصد کی تشریح پہلے شمارہ میں ان الفاظ میں کی گئی :

۲- انتخاب اودھ پنچ۔ ص ۸۰

"تین ہی احوال ہیں جن پر عام اخبارات کی تحریروں کا مدار ہے۔ پالیٹکس، سوسائٹی اور لٹریچر۔ مہذب بھی ان تینوں معاملات میں اپنے ناظرین سے پوری ترقی اور کامیابی کا وعدہ کرتا ہے۔"(۱)

لٹریچر کے سلسلہ میں شرر نے دلگداز کا انداز اختیار کرنے اور اس کے ادبی معیار کے مطابق کام کرنے کا اعلان کیا۔ اس اخبار میں مضامین کے علاوہ غیر ممالک کی خبریں بھی درج ہوتی تھیں اور لوکل کے عنوان سے لکھنؤ کی خبریں ہوتی تھیں اور موسم کا حال بھی۔ مولانا شرر کو سر سید کے خیالات سے اختلافات تھے لیکن سیاسی امور میں ان سے متفق تھے اور زبان و بیان کے معاملہ میں ان کے متبع تھے۔ اگرچہ شرر کے یہاں داستانوں اور کہانی کا انداز بیان خالص معروضی اور سائنٹفک انداز بیان کی صورت اختیار نہ کر سکا البتہ بعض خبروں اور شذرات میں ان کی نثر صحافیانہ ضرورتوں کو بحسن و خوبی پورا کرتی نظر آتی ہے۔ ہندو مسلم کے عنوان سے ایک مضمون میں متحدہ قومیت پر ان الفاظ میں اظہار خیال ملتا ہے :

"ہندوستان کی پولیٹکل قوت کا دارومدار بالکل ان دونوں مذکورہ قوموں کے اتفاق پر ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس وقت تک متواتر کوششیں کی گئیں کہ دونوں فریقوں میں ایک مضبوط اور ضروری نیشنلٹی پیدا ہو لیکن تجربہ روز بروز بتاتا جاتا ہے کہ وہ سب کوششیں خاک میں مل گئیں اور کوئی نتیجہ نہیں پیدا ہوا۔" (۲)

اس اخبار میں برطانوی سامراج کے بہت سے آمرانہ فیصلوں اور احکامات پر سخت تنقید کی گئی ہے بلکہ کبھی کبھی تو اس حد تک پہنچ گئے ہیں :

۱- "مہذّب" لکھنؤ۔ یکم اگست ۱۸۹۰ء بحوالہ کاروان صحافت۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، انجمن ترقی اردو، کراچی ص ۶۴

۲- "مہذّب" لکھنؤ۔ یکم ستمبر ۱۸۹۰ء بحوالہ کاروان صحافت۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، انجمن ترقی اردو، کراچی ص ۹۷

"ان سرکلروں کے ذریعہ مسٹر ہنری نے گورنمنٹ کی انصاف پسند پالیسی پر بہت بڑا دھبہ لگایا ہے۔ گویا ہندوستانی رؤسا بالکل غیر قابل اعتبار اور بنگالی بالکل باغی تصور کر لئے گئے ......" (۱)

شررؔ کا صحافتی شعور بالیدہ ہے۔ وہ صحافی کیلئے لازمی سمجھتے ہیں کہ وہ بے غرض اور بے تعصب ہو۔ وہ شکوہ سنج ہیں:

"ہمارے یہاں اس وقت تک اس فن شریف کی طرف ابھی توجہ نہیں ہوئی ہے۔ کوئی خاص رسالہ اس قسم کا اردو میں نہیں نکلتا جس میں بے غرضانہ، بلا لوث اور بے تعصبی سے کام لیا جاتا ہو۔"شرر کو شکایت ہے کہ اکثر اخبار نویس کم علم ہیں یا جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔ عیب جوئی کا نام نکتہ چینی رکھ دیا۔"

غرض "مہذب" نے اردو صحافت کے گیسو سنوارنے میں اپنا روشن کردار ادا کیا۔ معاصرین سے بحث و مباحثہ میں ان کا انداز ضرور تلخ ہوا اور سرسید و شبلی کے بعض خیالات کی تردید میں وہ اپنے معاشرتی تعصّبات کا شکار ضرور ہوئے لیکن اس کے باوجود ان کی روشن خیالی برقرار رہی۔

عبد الحلیم شررؔ نے ایک طویل مدت تک ماہانہ دلگداز کی ادارت کی اور اسے خون جگر سے شاداب رکھا۔ یہ ان کی ادبی و علمی صحافت کا شاہکار ہے۔ اسے ہم مجلّاتی صحافت کے ضمن میں موضوع گفتگو بناتے ہیں۔ یہ جریدہ ۱۸۸۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اور بیسویں صدی کے ربع اوّل تک شائع ہوتا رہا۔ اس رسالہ میں صرف ادبی مضامین ہی نہیں آتے تھے بلکہ ہندوستان اور بیرون ملک کے اہم سیاسی، سماجی اور تمدنی امور پر بھی اظہار خیال کیا جاتا تھا۔

۱۔ "مہذّب" لکھنؤ۔ یکم ستمبر ۱۸۹۰ء بحوالہ کاروان صحافت۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید، انجمن ترقی اردو، کراچی ص ۹۷

وطن کی اہمیت و فضیلت پر روشنی ڈالی جاتی تھی اور عجائبات فطرت اور عجائبات عام کا ذکر کیا جاتا تھا۔ جنوری ۱۸۸۷ء کے شمارہ میں شہر لندن میں خانہ خدا کے مصارف ادا کرنے کی جانب بیگم بھوپال اور نواب رامپور کو متوجہ کیا گیا ہے۔ اکتوبر ۱۸۸۷ء میں سلطان عالم واجد علی شاہ کے انتقال پر مفصل طور پر خبریں اور مضمون شائع کیا گیا ہے۔ اکتوبر ۱۸۸۷ء کے شمارہ میں نامہ نگاران اخبار پر ایک تحریر ہے۔ دسمبر ۱۸۸۷ء کے دلگداز میں وہ اپنی صحیفہ نگاری کا مقصود ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

> "دلگداز اردو رنگ سخن میں ایک نئی روح پھونکنے اور نئی طرح کی قوت مقناطیسی پیدا کرنے کے لئے جاری ہوا ہے .... اس میں شک نہیں کہ دلگداز اپنے رنگ میں اکیلا ہے۔" (۱)

دلگداز پر سرسید کے تہذیب الاخلاق کے اسلوب اور موضوعات کی پرچھائیں پڑی ہے۔ فروری ۱۸۸۸ء کے شمارہ میں "عمر رفتہ" پر ایک مضمون ہے جو سرسید کے انداز میں ہے۔ اسی سال جنوری کے دلگداز میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس میں مولوی شبلی نعمانی پروفیسر محمڈن کالج علیگڑھ کے مضمون "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" کا ایک حصہ شائع کیا گیا ہے اور اس مضمون کی توصیف کی گئی ہے۔ دلگداز سیاسی سے زیادہ تعلیمی بیداری پیدا کرنے کا قائل نظر آتا ہے۔ قوم کی تعلیمی ترقی کے لئے فنڈ جمع کرنے کی غرض سے محمڈن نیشنل والنٹیر بنانے کا اعلان کرتے ہیں اور انجمن حمایت اسلام لاہور کا بار بار ذکر خیر اس رسالہ میں ملتا ہے۔ اس رسالہ کی تحریروں اور شذرات کے عنوان کے لئے شعر اور مصرعوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شذرے کا عنوان ہے ؎

آئے قیامت آئے پروا یہاں کسے ہے
خواب لحد سے اے دل اب کون جاگتا ہے

۱- دلگداز۔ دسمبر ۱۸۸۷ء (آزاد لائبریری، علیگڑھ)

یہ مضمون مئی ۱۸۸۸ء کے شمارہ میں ہے۔ جون ۱۸۸۸ء کی اشاعت میں ایک روز آنہ اخبار کی اشاعت کا اعلان نظر آتا ہے۔ شرر کا مزاج رومانی ہے۔ وہ تاریخ کو رومانی ناولوں کا پیراہن عطا کرتے ہیں اور ان کے رسالہ میں یہ ناول قسط وار چھپتے تھے۔ اس وقت صحافت کو عوامی مقبولیت اسی لئے حاصل تھی کہ اس میں ہر مذاق کے لوگوں کی رعایت مد نظر رکھی جاتی تھی۔ شرر ایک بیدار مغز انشاء پرداز اور صحافی ہیں۔ گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہتے ہیں۔ کبھی دمشق، کبھی بغداد، کبھی ترکی، کبھی مصر اور کبھی ایران و عرب کی خبر لیتے ہیں اور یہاں کے اہل قلم کی تحریروں کے تراجم پیش کرتے ہیں۔

دسمبر ۱۸۸۸ء کے شمارہ میں یہ نوٹ کانگریس کے بارے میں نظر آتا ہے :

> ''ہندوستان کی ملکی حالت اور مسلمانوں کی قومی صورت سے کوئی ایسا پہلو نہیں بدلا کہ ہم اپنے دل کو کچھ تسکین دے سکیں۔ ایک کانگریس کا ہنگامہ گرم رہا۔ قطع نظر اس کے کہ ہم مخالف ہیں یا موافق اتنا ضرور کہیں گے کہ ہندوستان کی بد نصیبی سے اس کانگریس نے ہندو مسلمانوں میں سخت مخالفت اور عداوت پیدا کر دی۔ گو یہ مخالفت پیشتر سے تھے مگر ۸۸ء نے زیادہ اشتعال دلایا۔'' (۱)

اس عبارت کا انداز خالص اخباری اور ہر طرح کی ادبی چاشنی اور رکھ رکھاؤ سے معرا ہے۔ یہی انداز بعد میں عوامی اخبارات میں اختیار کیا گیا۔

اودھ اخبار

پہلی جنگ آزادی کے بعد جاری ہونے والے اخبارات میں نمایاں مقام اودھ اخبار کو حاصل ہے جو منشی

---

(۱) دلگداز دسمبر ۱۸۸۸ء (آزاد لائبریری، علیگڑھ)

نولکشور نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ سے ہفتہ وار جاری کیا۔ آغاز میں یہ صرف ۴ صفحات پر مشتمل تھا پھر ۴۸ صفحات تک پہنچ گیا۔ اخبار میں اس عہد کے ممتاز اہل قلم نے علمی و ادبی صحافتی خدمات انجام دیں۔ ان میں مولوی غلام محمد خاں تپش، مرزا غالب، احمد حسن شوکت، عبد الحلیم شرر، سید امجد علی، مرزا حیرت دہلوی، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا جالب دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۸۷۴ء میں یہ اخبار روزنامہ بن گیا۔ یہ اخبار ہمیشہ اعتدال و توازن کی راہ پر گامزن رہا۔ ۱۸۷۸ء میں رتن ناتھ سرشار اس کے مدیر ہوئے اور ان کا "فسانہ آزاد" قسط وار چھپنے لگا۔ مولانا عبد الحلیم شرر کچھ دنوں اس سے وابستہ رہے۔ اس اخبار کا ادبی معیار بلند تھا۔ اس میں طنز و مزاح کے نشتر بھی موجود تھے۔ "اودھ پنچ" سے اس کی برابر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ طنزیہ انداز اس اقتباس میں ملاحظہ فرمائیں :

> "ہندوستان میں اخباروں کا جاری ہونا آج کل کیمیائی بوٹی ہو رہا ہے۔ ہم خرما ہم ثواب کا مزا آ رہا ہے۔ یعنی اخبار جاری کیا اور نامور ہو گئے۔ بوسیدہ لکڑی کا ایک چرخ چوں چرخا رکھ لیا اور قلم کے تکلے پر پرانی دھرانی روئی کا سوت کاتنا شروع کر دیا ...." (۱)

بقول ڈاکٹر مسکین علی حجازی

> "اودھ اخبار ایک معیاری اخبار تھا جس میں قومی اور بین الاقوامی خبریں، خبروں کے پس منظر پر بہت سے مضامین عام سیاسی و معاشرتی امور پر مختلف النوع مواد موجود ہوتا تھا" (۲)

۱- اودھ اخبار، لکھنؤ ۲۸ر جولائی ۱۸۸۰ء

۲- پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ۔ مسکین حجازی ص ۱۸

اودھ اخبار کو اپنے ابتدائی دور میں اودھ کے معزول حکمراں واجد علی شاہ سے تعلق خاطر تھا جو مٹیا برج میں گوشہ نشین تھے۔ وہاں اودھ اخبار کی جانب سے ایک خاص نامہ نگار مقرر تھا جو وقتاً فوقتاً خبر نامے ارسال کرتا تھا۔ اہل لکھنؤ ان خبروں سے لطف اندوز ہوتے۔ یہ سلسلہ طویل مدت تک جاری رہا۔ ۲۶؍ جنوری ۱۸۸۰ء کے شمارے میں ملاحظہ فرمایئے :

"۱۹؍ جنوری کو بادشاہ کے حکم کے بموجب عجیب و غریب جانوروں کے ہزارہا پنجرے کوٹھی مرصع منزل میں نہایت عمدگی سے رکھے گئے اور دس بجے دن سے تماشائیوں کے آنے کا حکم ہوا۔ قریب دوپہر کے ہزارہا انگریز اور ہندوستانی اور بنگالی جمع ہو گئے اور شام کے وقت مٹیا برج میں سوائے گاڑیوں اور آدمیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ گاڑی کا کرایہ نہایت درجہ گراں ہو گیا تھا۔" (۱)

آگے چل کر اس خبر میں جو منظر کشی ہے اور اشیا و مناظر و ازدہام کا جو مصور نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ اودھ اخبار کے معیار وقائع نگاری اور داستانی و افسانی انداز بیان پر روشنی ڈالتا ہے۔ انداز تحریر میں روانی، شستگی اس بات کی غماز ہے کہ اب اردو نثر ہر طرح کے واقعات کو بطریق احسن بیان کرنے پر قادر ہو چکی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک معزول و مجبور حکمراں کے اس ذوق پر اور زندگی کے دیگر مسائل سے بے نیاز ہو کر زندگی کو تفریح محض بنانے کے مشغلہ پر کوئی حکیمانہ نگاہ نہیں ڈالی جاتی۔ اودھ اخبار کے وقائع نگار ہر شئے پر نگاہ ڈالتے ہیں اور ان کی تصویر کشی بھی خوب کرتے ہیں مگر یہ نگاہ سطحی محسوس ہوتی ہے اور واقعات کی تہہ میں اترنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ۲۶؍ جنوری ۸۰ء میں کے شمارے میں واجد علی شاہ کے چڑیا خانے کے افتتاح کے عنوان سے ایک اور

۱- اودھ اخبار، لکھنؤ ۲۴؍ جنوری ۱۸۸۰ء

داستان درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ افتتاح کے دوسرے دن ایک لاکھ تماشائی آئے۔

"مہتمم جانور خانہ حضرت کے کہتے ہیں کہ دس ہزار پانسو سیتالیس جانور ہر قسم کے سوائے کبوتران اور ماہیان کے اس تاریخ موجود تھے۔" (۱)

اس کے بالمقابل واقعہ نگار انگریزوں کے عجائب گھر میں محض دو ہزار جانوروں کا ذکر کرتا ہے اور یہ التماس کرتا ہے "اس پر ہماری گورنمنٹ کو حضرت (واجد علی شاہ) کی تہی دستی پر خیال فرمانا چاہئے۔ پھر ان جانوروں کی حالت زار کا بھی ایک مقام پر ذکر ہے :

"ایک ہزار چھ سو روپئے کے جو چار ٹٹو خریدے ہوئے تھے وہ اب نہایت درجہ لاغر ہوگئے ہیں۔ مٹیا برج میں لوگ کہتے ہیں کہ اگر بادشاہ کے روبرو یہ ٹٹو پیش ہوں تو وہ ہرگز سلطانی گاڑی کے واسطے ایسے ٹٹوؤں کو پسند نہ کریں۔" (۲)

دلچسپ بات یہ ہے کہ مٹیا برج سے متعلق ایسی خبریں اودھ اخبار میں آتی رہتی تھیں جن سے ایک معزول حکمراں کی محرومی و مجبوری کی سچی تصویر آنکھوں کے سامنے آتی تھی۔ ۲۴ / مارچ ۸۰ء کے شمارے میں عباسی بیگم کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے نامہ نگار لکھتا ہے :

"انکی اولاد کی پرورش دیکھنا چاہئے کس طرح پر ہوتی ہے۔ ان بیگم صاحبہ کو پینتس روپئے تنخواہ ملتی تھی انہوں نے کوئی جائیداد بھی نہیں چھوڑی ہے۔" (۳)

اودھ اخبار کا نقطۂ نظر سائنٹفک اور عقلی نہیں۔ وہ اپنے عہد کے عوام کے توہمات اور بے راہ روی کی جیوں

۱- اودھ اخبار، لکھنؤ ۲۴ / جنوری ۱۸۸۰ء

۲- اودھ اخبار، لکھنؤ ۲۴ / جنوری ۱۸۸۰ء

۳- اودھ اخبار، لکھنؤ ۱۸۸۰ء

کی تیوں تصویر کشی کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ٹھیٹ حقیقت نگاری کے سوااس کے پاس کوئی نقطۂ نظر یا کوئی نصب العین نہیں۔ اپنے عہد کے ثقافتی زوال پر وہ کوئی تبصرہ نہیں کرتا۔ معزول حکمراں کے محل میں آتش بازی اور دیگر تفریحات کا ذکر وہ کافی مزا لے لے کر کرتا ہے۔ عبارت نہایت سادہ و سلیس و رواں ہے :

"خوب آتش بازی چھوڑا کئے۔ بہت عمدہ عمدہ آتش بازی کاری گران کلکتہ کے ہاں سے تیار ہو کر آئی تھی۔ اور کاری گران لکھنؤ کی علحدہ آتش بازی تیار تھی۔ مقابلہ میں چھوڑائی گئی۔ ازاں بعد غبار سے اڑا لئے گئے تمام شہزادے پیازی اور عمدہ پوشاکیں پہن کر آئے تھے۔" (۱)

لیکن کبھی کبھی اودھ اخبار کے وقائع نگاروں کی رگ تنقید پھڑک جاتی ہے اور وہ ہزار جذباتی رشتوں کے باوجود اپنے عہد کے تناظر میں گفتگو کرتا ہے جب کہ بادشاہت کا دور رخصت ہو چکا ہے اور انسانی حقوق کا شعور ذہنوں میں بیدار ہو رہا ہے، لکھتے ہیں :

"بادشاہ کے یہاں نوکروں کو قیام نہیں۔ یہاں ذرا سی بات میں آدمی سرخ رو ہو جاتا ہے اور ذرا سی بات میں سیاہ رو۔ حباب کو قیام ہے لیکن پادشاہ کی نوکری کا کچھ قیام نہیں۔" (۲)

اودھ اخبار کو عوامی مقبولیت حاصل تھی اس لئے کہ وہ عوامی زبان میں عوام کی دلچسپی کی چیزیں مہیا کر رہا تھا۔ لکھنؤ کے عوام کو کبوتر بازی کا شوق تھا تو اس طرح کی خبریں اس میں چھپتی تھیں :

"بادشاہ سوار ہو لئے اور سلطان خانے ہی میں رہے اور کبوتر بازی کا شغل دیر

۱- اودھ اخبار۔ ۲۵ر فروری ۱۸۸۰ء

۲- اودھ اخبار، لکھنؤ ۲ر فروری ۱۸۸۰ء

تک ہوتا رہا۔ اسی اثنامیں شہزادہ مرزا جوگی کے کبوتروں پر نظر جاپڑی۔ لوگوں نے کہا کہ فلاں شہزادے کے ہیں۔ کہا اگر پھر ان شہزادے نے ایسی حرکت کی تو پادشاہ نہایت ناراض ہوں گے......" (۱)

اسی اخبار میں اس طرح کی خبریں بھی ہیں کہ بادشاہ معتبر علی خاں سے ناراض ہوگئے اس لئے کہ وہ شاہی کہار میں سے پاؤں دبوا رہے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک کارندہ پادشاہ کے لحاف جلا کر چاندی نکال رہا تھا۔ کپڑا جلنے کی بو سے بادشاہ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ لحاف کسی کو دے دینا چاہئے تھا۔ معلوم ہوا کہ ایک سو پچاس تولہ چاندی اس میں نکلی تھی۔

پیسہ اخبار

۱۸۸۷ء میں فیروزوالا پنجاب سے ہبت روزہ "پیسہ اخبار" جاری ہوا۔ اس کے مالک و مہتمم منشی محبوب عالم تھے۔ کچھ دنوں بعد یہ لاہور منتقل ہو گیا اور انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے روزنامہ بن گیا۔ اس اخبار کو بے حد مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔ یہ کمزور طبقات بالخصوص مسلمانوں کے حقوق کے لئے اپنے صفحات پر جدوجہد کرتا تھا۔ متانت و سنجیدگی اس اخبار کا طرۂ امتیاز تھا۔ تہذیبی معیار سے گری ہوئی کوئی بات یہ گوارا نہیں کرتا تھا۔ بیسویں صدی میں جب غبار خاطر اور پھر زمیندار منظر عام پر آئے اور مولانا آزاد و ظفر علی خاں کی شعلہ بار تحریریں صحافت کا حصہ بن گئیں تو پھر پیسہ اخبار کی مقبولیت ختم ہونے لگی جو ابالی ہوئی کھچڑی سے لوگوں کی تواضع کر رہا تھا چنانچہ ۱۹۲۴ء میں یہ بند ہو گیا۔ اس اخبار نے اردو صحافت کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا اور بغیر کسی بیساکھی خود اپنی قدر و قیمت کے بل پر خود کفیل ہونے کی روایت قائم کی۔ اس اخبار نے خبروں اور شذرات کے

۱- اودھ اخبار، لکھنؤ ۲۸/ جنوری ۱۸۸۰ء

اندر اعلیٰ درجہ کی معروضیت اختیار کی اور ذاتیات کی سطح تک اترنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس کے شذرات کی جامعیت و تاثیر اس کا امتیاز خاص تھا۔ بقول ڈاکٹر مسکین علی حجازی :

"اس کی زیادہ یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے مکتب صحافت کا کام انجام دیا اور اس میں کئی ایسے لوگوں نے صحافتی تربیت حاصل کی جو بعد ازاں نامور صحافی اور ایڈیٹر بنے۔ مثلاً لالہ دینا ناتھ نے پیسہ اخبار سے وابستہ رہنے کے بعد "ہندوستان" جاری کیا۔ حکیم نبی بعد ازاں الحکما کے ایڈیٹر بنے۔ منشی احمد دین نے بعد میں غمخوار جاری کیا۔ میر جالب دہلوی پیسہ اخبار کے مدیر رہنے کے بعد ہمدرد میں کام کرتے رہے، پھر ہمدم کے ایڈیٹر مقرر ہوئے بعد اپنا اخبار 'ہمت' جاری کیا ......" (۱)

اخبار سائنٹفک سوسائٹی

پہلی جنگ آزادی کے بعد اردو صحافت میں نیا انداز اور نیا آہنگ لئے ہوئے ۱۸۶۶ء میں "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" منظر عام پر آیا۔ اسکی پیشانی پر یہ عبارت درج ہوتی تھی :

جائز رکھنا چھاپے کی آزادی کا ہے کام ایک دانا سیاست کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک آزاد رعیت کا۔"

اس عبارت کی ساخت اگر اس قدامت کو منعکس کرتی ہے جو اردو نثر کا اُس عہد میں شعار تھی۔ البتہ اس میں رنگینی و شعریت کی کوئی رمق موجود نہیں۔ البتہ اسی اخبار نے اپنے عہد کے سنگین مسائل کا بڑی حسن و خوبی سے احاطہ کیا۔ ۱۸۶۷ء میں شاہجہاں پور میں ایک انگریز نے تین ہندوستانیوں کو قتل کر دیا تو اس اخبار نے لکھا :

۱- پاکستان و ہند میں مسلم صحافت۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی، سنگ میل لاہور ص ۲۸

''نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس نادان یورپین نے ان بے چارے ناکردہ گناہ ہندوستانیوں کے قتل کو اس ظلم کی مکافات تصور کیا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں کسی اور طرف سے ہوا تھا اور جس میں ان مقتول ہندوستانیوں کو کچھ بھی دخل نہیں تھا۔'' (۱)

گورے اور کالے کے درمیان امتیاز اور تعزیرات ہند میں ایسی گنجائش پیدا کرنا جو قاتلوں کے لئے بچ نکلنے میں معاون ہو اس اخبار کا موضوع بنتی رہیں اور اس نے جرأت اظہار سے ان بے انصافیوں پر اظہار خیال کیا اور کھلے ہوئے الفاظ میں اپنا موقف واضح کیا۔ اگرچہ لب و لہجہ بے حد مہذب اور شائستہ اور پیرایۂ اظہار کافی نرم ہے۔ لکھتے ہیں :

''اگر آئندہ ایسے امور میں ڈاکٹروں اور جیوریوں کی نیت بخیر رہی تو پھر مقتول کے مریض ہونے اور قاتل کے نشہ باز ہونے سے بڑی گنجائش ہوگی اور ہندوستانیوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔''

آگے چل کر لب و لہجہ اور سخت ہونے لگا اگرچہ شائستگی کلام برقرار رہی :

''ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اندیشۂ بغاوت اس بات سے کم ہو جاوے گا اگر باشندگان کے اسلحہ اتار لئے جاویں گے اور ان سے سلوک بد کیا جاوے گا۔'' (۲)

''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' چونکہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا اور چونکہ اس کے مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ مسلمان جدید علوم و فنون سیکھ لیں اور اس کے لئے حکمرانوں کی زبان سے واقفیت حاصل

۱- اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علیگڑھ ۱۲/ مئی ۱۸۷۶ء

۲- اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علیگڑھ ۱۲/ مئی ۱۸۷۶ء

کریں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اخبار انگریزوں کو ہندوستانیوں کے احوال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اسلئے اس کی خبروں اور مضامین پر انگریزی الفاظ اور اسالیب کا گہرا اثر ہوا۔ خبریں نہایت معتبر اور صحت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھیں۔ افسانوی اور داستانی رنگ نہیں پایا جاتا تھا۔ ہر بات مدلل ہوتی تھی اور لب و لہجہ پر منطقی انداز حاوی تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالی اس اخبار کے متعلق لکھتے ہیں :

"اس میں سوشل اخلاقی، علمی اور پولیٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ انگریزی اخبارات سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے، برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے ...... شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچہ کے اجرا سے شروع ہوتی ہے۔" (۱)

یہ اخبار سر سید کی وفات کے بعد تک جاری رہا۔

اخبار عام

یکم جنوری ۱۸۷۱ء کو پنڈت قلندر رام نے لاہور سے ہفت روزہ اخبار عام جاری کیا جو کچھ دنوں کے بعد سہ روزہ اور بالآخر روزنامہ بن گیا۔ اس کے مدیر پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ اس میں خبروں کے علاوہ شذرات اور مضامین ہوتے تھے۔ زبان نہایت عام فہم اور آسان ہوتی تھی جسے ہر خاص و عام سمجھ سکتا تھا۔ اس اخبار کی نثر پر قدامت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ۲۷ ستمبر ۱۸۸۴ء کا ایک شذرہ ملاحظہ ہو :

"عنقریب حکم جاری ہونے والا ہے کہ عدالتوں کے سمن بذریعہ ڈاک تقسیم ہوا کریں گے۔ بیشک اس سے ہر قسم کی سہولت ہو جائے گی۔ بشرطیکہ غریب چٹھی

۱- حیات جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالی

رسانوں کی تنخواہوں کی طرف بھی عنایت کی توجہ کی جاوے۔ڈاک کا کام پچھلے دنوں جتنا کچھ بڑھایا گیا ہے بیشتر سے دوچند ہے اور باوجود اس کے چٹھی رسانوں کی تنخواہوں وہ تین کانے منتظمان کی ناقدرشناسی کی طرف انگلی کررہے ہیں۔" (۱)

ادارتی شذرات میں کبھی کبھی خبروں پر تبصرہ کے بجائے صبر علم اخلاق جیسے موضوعات پر اظہار خیال نہایت سہل زبان میں کیا جاتا تھا۔ "اختر شہنشاہی" کے مطابق "اردو پڑھنے والوں کے لئے اس سے بہتر اخبار ہندوستان میں کوئی نہیں تھا۔" شاید اس کی بہتری کا راز یہی تھا کہ اس نے عوام کی زبان اور عوام کے لب ولہجہ میں عوام سے گفتگو کا اسلوب اختیار کیا۔

۱- بحوالہ پاکستان وہند میں مسلم صحافت۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی ص ۲۸

باب سوم

اردو صحافت

۱۹۰۱ء سے تحریک خلافت ۱۹۲۰ء تک

بیسویں صدی کے آغاز میں سرسید کی عقلیت اور علمیت کے خلاف صحافت اور ادب میں رد عمل رونما ہوا۔ بقول ڈاکٹر مسکین علی حجازی

"سرسید کی تحریک (بیسویں صدی میں) ٹیگور اور آسکر وائلڈ کے زیر اثر رومانوی بن گئی۔ چنانچہ مخزن کے بیشتر لکھنے والوں پر رومانیت غالب تھی۔ یہ تحریک ہلکے پھلکے انداز کی کارفرمائی اور زبان میں ادبی چاشنی سے عبارت ہے۔" (۱)

اس صدی کے آغاز میں صحافت پھر ادب کے سانچے میں ڈھل گئی بلکہ ادبیت نے صحافت کو اپنے نرغہ میں لے لیا۔ اکثر اخبارات مثلاً صدائے عام، ریاض الاخبار وغیرہ سے وابستہ صحافی بنیادی طور پر ادیب تھے اور وہ صحافت کو مکمل طور پر ادب میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس عہد میں ایسے صحافیوں کی بھی کمی نہ تھی جو صحافی پہلے تھے اور ادیب بعد میں۔ ان کے اسلوب میں ندرت و جدت کے باوجود صحافت کی سادگی اور عمومیت پسندی ملتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی بیک وقت ادیب بھی تھے، خطیب تھی تھے، مفکر و عالم بھی تھے اور سیاست کے مرد میدان بھی۔ شاید اس پر شور تاریخی عہد میں کوئی صحافی خطابت اور مبالغہ کے بغیر دو قدم آگے چل نہیں سکتا تھا۔ رجز خوانی اور نعرۂ رستاخیز کے بغیر صحافی اپنی بات ادھوری تصور کرتا تھا۔ ان بزرگوں نے صحافت میں جذبات کو بحسن و خوبی شامل کر دیا اور صحافتی اسلوب کو ادبی اسلوب بنادیا۔ پر جوش جارحانہ اور چونکادینے والا انداز عوام میں بھی پسند کیا جاتا اور خواص میں بھی۔

اسی عہد میں اردو صحافت کو خوش قسمتی سے ایسی پر شعور اور انقلاب آفریں شخصیتیں ملیں جنہوں نے صحافت کے رتبے کو بہت بلند کر دیا۔ ان کی تحریروں کا معیار اور ان کی زندگی کا مشن بے حد بلند ہے۔ انہوں نے

۱۔ پاکستان و ہند میں مسلم صحافت۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی ص ۴۰

صحافت کو تجارت کا آلہ کار نہیں بنایا۔ ان کی ہر ہر سطر میں ان کی ذات اور ان کے جذبہ واحساس کی آمیزش ہے۔ ان کے سامنے زندگی کا ایک نصب العین اور ایک واضح مشن تھا۔ وہ ایک طے کردہ منصوبہ کے تحت لکھ رہے تھے اور وہ منصوبہ پیغمبرانہ بلندیوں سے آشنا تھا۔ اگرچہ وہ دیگر صحافیوں کی طرح وقتی اور ہنگامی مسائل پر لکھ رہے تھے لیکن انہوں نے ادب کی گرمی و حرارت کے بغیر ایک سطر نہیں تحریر کیا۔ رشید حسن خاں صاحب کا خیال ہے کہ ادب و صحافت دو متضاد دھارے ہیں جو بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ

> "مولانا ابوالکلام آزاد کا انداز نظر صحافیانہ نہیں تھا۔ ان کی شخصیت ان کی طبیعت ان کا جذبہ اور ان کا احساس یہ چیز ان کی تحریروں میں شامل ہے۔ یہ ادب ہے۔" (۱)

رشید حسن خاں صاحب کی اس بات سے اختلاف ممکن نہیں کہ کوئی بھی قلم کار اسی وقت کسی بھی شعبہ فن کا نرالا اور لازوال شاہکار اسی وقت پیش کرتا جب اس کا جذبہ اور احساس اس کی تحریروں میں شامل ہو مگر یہ انہوں نے کیونکر تصور کر لیا کہ صحافت محض تجارت ہے اور صحافی کٹھ پتلیوں کی طرح اخبار کے مالکوں کے اشاروں پر رقص کرتا ہے اور خبروں پر حاشیہ آرائی کے سوا اس کا کوئی کردار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صحافی اسی قدر بلند پایہ ادیب ہو سکتا ہے جس قدر ایک نقاد ایک ناول نگار، ایک انشائیہ نگار و خاکہ نویس ہوتا ہے۔ بلکہ پروانہ ردولوی کے الفاظ میں تو اس صداقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اردو نثر درحقیقت صحافت کی مرہون منت ہے جس نے اس کی نشو و نما میں بنیادی کردار ادا کیا۔ وہ اپنے اس دعویٰ کی تائید میں کہ اردو نثر اردو صحافت کی پیدا کردہ ہے اور اردو صحافت سے پہلے اردو نثر کا کوئی وجود نہ تھا ڈاکٹر قیصر شمیم کی کتاب "اردو ادب پر ذرائع ترسیل عام کے اثرات" کا یہ

۱- تلاش و تعبیر۔ رشید حسن خاں ۱۹۸۸ء مکتبہ جامعہ، دہلی ص ۲۹۴

حوالہ دیتے ہیں :

"پریس کے آجانے کے بعد ضرورت تھی ایسے اسالیب بیان کی جو محض مطبوعہ صفحہ کے ذریعہ خیال کی ترسیل کرا سکے۔ اس ضرورت نے نثر میں سادگی، سلاست اور روانی پیدا کی تھی۔ دوسری طرف انشاپردازی کے مقابلہ میں معنوی ربط کو اہمیت بخشی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آخر میں مدعا نویسی بڑی اہمیت اختیار کر لیتی ہے اور عبارت کی تنظیم اس کے تحت زیادہ مقبولیت کے ساتھ ہونا شروع ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی انیسویں صدی کے ان ادباء کے یہاں نمایاں طور پر نظر آتی ہے جو جدید نثر کے معمار کہے جاتے ہیں اور پریس سے کم و بیش وابستہ تھے۔"(۱)

اس میں شک نہیں کہ جام جہاں نما کے اجراء کے وقت سے ہی اردو نثر کے گیسو صحافت سنوارتی رہی۔ اردو کو جب انگریزوں نے انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں فارسی کی جگہ سرکاری زبان بنایا اس وقت اردو نثر کی ضرورت اور اہمیت بڑھ گئی اور بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی :

"اسی وقت سے اردو اخباروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور اس طرح اردو صحافت نے اردو نثر کے بال و پر سنوارنے کا کام بڑے پیمانہ پر کیا۔" (۲)

مزید براں صحافت کی راہ سے طنز و مزاح کو اردو میں غیر معمولی فروغ ہوا اور اردو نثر کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آج اخباروں میں فکاہیہ کالم اس کی دلکشی کا محور ہوتے ہیں۔ صحافت میں شذرات نگاری اور اداریہ

۱- اردو صحافت کا استغاثہ۔ پروانہ ردولوی، حیا پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۹۴ء ص ۵۵

۲- بحوالہ اردو صحافت کا استغاثہ۔ پروانہ ردولوی ص ۵٦

نویسی ایک ادبی فن ہے۔ خبروں کی زبان بھی ادبی ہوتی ہے لیکن اداریہ میں تو ادب کی چاشنی نہ ہو تو بے جان ہو جاتا ہے۔ بقول راحت سہیل صاحبہ :

"خبروں میں جہاں کہیں خبر نویس نے اظہار رائے کیا ہے وہ بھی ادبی پیرایہ میں ہے۔" (۱)

اس میں شک نہیں کہ اردو کو صحافت کی بدولت سید محمد بلگرامی، میر غلام علی، سدا سکھ لال، مولوی باقر، سر سید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر، شبلی نعمانی، ابوالکلام، حسرت موہانی اور شرر جیسے اصحاب قلم میسر آئے۔ پروانہ ردولوی کا یہ تاثر مبنی بر حقیقت ہے :

"اردو صحافت نے اردو زبان کو فروغ دے کر ادبی زبان بنانے کے سلسلہ میں جو خدمت انجام دی ہے اس سے لاکھ چشم پوشی کی جائے مگر جب کوئی بھی اردو زبان کے فروغ کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ سب سے پہلے اردو صحافت ہی کا ذکر کرے گا جس نے اردو کے نثری ادب کا باقاعدہ آغاز کیا اور اردو شاعری کو بند کمروں اور نجی محفلوں سے عوام پہنچا کر اسے مقبول بنایا۔" (۲)

آیئے مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ۱۹۰۱ء سے تحریک خلافت ۱۹۲۰ء تک کے ممتاز اردو اخبارات اور صحافیوں کی خدمات کا زبان و ادب اور اسالیب بیان کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے۔

حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو صحافت کے افق پر ایک ایسا ستارہ نمودار ہوا جو نہ صرف اعلیٰ پایہ کا ادیب و

۱- بحوالہ اردو صحافت کا استغاثہ۔ پروانہ ردولوی ص ۷۴

۲- بحوالہ اردو صحافت کا استغاثہ۔ پروانہ ردولوی ص ۷۵

شاعر تھا بلکہ ملک کی سیاسی زندگی میں فعال کردار ادا کر رہا تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے کے ۱۵ سال ہندوستان کی تاریخ میں کم ہنگامہ خیز نہ تھے۔ اس وقت دیگر زبانوں کے اخبارات مغربی استعمال کے خلاف تیز و تند مضامین لکھ رہے تھے۔ لاہور کے اخبار پنجابی اور کلکتہ کے "بندے ماترم" میں مغرب کے خلاف اعلان جنگ کی کیفیت تھی۔ لاہور کا پیسہ اخبار اور "وطن" امرتسر کا "وکیل" معتدل مزاج اور لب و لہجہ کے اعتبار سے نرم اور شیریں کلام تھے۔ ابھی مولانا آزاد کا الہلال اور محمد علی کا "کامریڈ" اپنی شعلہ باری کے ساتھ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ اردو اخبارات جو تھے وہ سہمے سہمے تھے اور انتہا پسند تحریکوں سے کچھ خوفزدہ تھے۔ اس وقت ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے الفاظ میں :

"مولانا حسرت موہانی نے ایسا نعرۂ مستانہ بلند کیا کہ ایک طرف مسلمان ٹھٹک کر رہ گئے دوسری طرف حکومت نے اپنی جناب اس گستاخی کو پسند نہ کیا بلکہ اس بے تکلفی پر ناک بھوں چڑھائی اور انہیں دوسال کے لئے جیل میں بند کر دیا۔" (۱)

مولانا حسرت موہانی کے اردوئے معلی ۱۹۰۳ء میں علیگڑھ سے جاری کیا۔ اس رسالہ کے بشتر مضامین وہ خود لکھتے تھے۔ یہ رسالہ ۴۰ سال تک جاری رہا۔ اس کی محض علمی و ادبی حیثیت نہیں تھی بلکہ اس میں تند و تیز سیاسی شذرات بھی ہوتے تھے۔ حق گوئی و بے باکی کی نرالی روایت اس رسالہ کے ذریعے قائم ہوئی اور اردو صحافت کی تاریخ میں اسنے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس طرح کے شذرات کی زبان اور انداز بیان بے حد ولولہ انگیز اور حیات بخش دلپذیر اور حرارت خیز ہوتا تھا۔ اس کے ثبوت کے لئے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

"ہم لوگوں کا فرض ہونا چاہئے کہ امر حق کے اظہار میں مطلق باک نہ کریں

۱- کاروان صحافت۔ کراچی عبدالسلام خورشید ص ۹۷

اور صداقت کی آخری فتح پر یقین رکھتے ہوئے راہ حق میں جو مصائب پیش آئیں ان کو بہ کشادہ پیشانی برداشت کریں اور خوب سمجھ لیں کہ آزادی کی دولت آسانی سے نہیں حاصل ہوا کرتی۔ یہ جو حکومت کی جبروت سے بظاہر تحریک حریت کو فاش شکست ہوئی ہے اس پر افسردہ اور مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ابھی ہماری قوت نا مجتمع، نا منظّم ہے۔ اس لئے ہم کو ابھی کچھ دنوں کے لئے ایسی ایسی بہت سی ناکامیوں اور شکستوں کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا۔" (۱)

اس عبارت کی ساخت اس وقت کے عام پیمانہ صحافت پر پوری اترتی ہے اگرچہ فارسی و عربی کا مذاق اس ماحول میں اسقدر مزاج میں رچا بسا تھا کہ اس طرح کی ترکیبیں استعمال کرنا عام بات تھی۔ 'قوت نا مجتمع، بہ کشادہ پیشانی'۔ لیکن مجموعی طور پر عبارت رواں اور خوش آہنگ ہے۔

حسرت موہانی کو ۱۹۰۸ء میں دو سال قید کی سزا اپنی بے باکی کے سبب جھیلنی پڑی اور قید سے باہر آنے پر انہیں مشورہ دیا گیا کہ نرم روی اختیار کریں۔ اس پر ان کا رد عمل ملاحظہ ہو :

"مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے جس کو محض کسی خوف یا مصلحت کے لحاظ سے ترک یا تبدیل کرنا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔" (۲)

اس رسالہ کا سیاسی پہلو تو نمایاں تھا ہی تہذیبی پہلو بھی دلچسپ ہے۔ وحید الدین سلیم پانی پتی مدیر انسٹیٹیوٹ

۱- اردوئے معلّیٰ، حسرت موہانی علیگڑھ ۱۹۰۷ء مضمون بعنوان "بے چینی کے آثار"۔

۲- اردوئے معلّیٰ، حسرت موہانی علیگڑھ نومبر ۱۹۰۷ء ص ۴۰

گزٹ، علیگڑھ کے مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے ایک مضمون میں مسلمانوں کو مصوری، نقاشی، شاعری، موسیقی، فن آراستگی کی ترغیب دلائی ہے اور اس کو جائز قرار دیا ہے۔ ان کا انداز تحریر سر سید کی طرح پر جوش اور ولولہ انگیز ہے۔ لکھتے ہیں :

> "اس عام ولولے اور جوش کے زمانہ میں جب کہ اسلام ہر طرف بیدار نظر آتا ہے اور ہر ملک کے مسلمان قدیم تعصّبات اور اوہام کی زنجیروں سے آزاد ہو رہے ہیں اور یقین کرنے لگے ہیں کہ اسلام کسی علم و فن کی تعلیم کے مانع نہیں ہے اور زمانہ حال کے تمدن اور مسلمانوں کے قدیم تمدن میں ایک طرح کی مشابہت ہے ہندوستان کے مسلمانوں کو لازم ہے کہ فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کریں اور ان کے ذریعہ سے اپنے دل و دماغ کو روشن کریں۔" (۱)

اس رسالہ کی یہ خوبی تھی یہ ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کر رہا ہے اور معاشرہ کے ہر طبقہ کو سیاسی امور میں دلچسپی لینے پر اکساتا تھا۔ اس میں جو تراجم انگریزی اخبارات کے دیئے جاتے تھے وہ بھی فصیح رواں سلیس اور شستہ ہوتے تھے۔ مثلاً انڈین سوشیالوجسٹ لندن کے ایک مضمون کے ترجمہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

> "انگریزی حکومت ہند کے اغراض میں خلوص نیت ابتدا ہی سے نہیں ہے کیونکہ ان اغراض کی بنا طمع زر اور ہوس اختیار پر قائم ہوئی تھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اہل ہند کو اگر کوئی نفع برٹش گورنمنٹ سے اتفاقی طور پر حاصل ہو جائے تو وہ

۱- اردوئے معلیٰ، حسرت موہانی علیگڑھ مئی ۱۹۰۷ء ص ۱۳

اس کے ممنون بھی ہوں۔" (۱)

حسرت موہانی قوم کو برطانوی مال کے بائیکاٹ کی دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سر دست ہمارے نزدیک ہر محبّ ملک کو انگریزی تشدد کے مقابلہ میں مزاحمت دفاعی کی پالیسی پر کاربند ہو کر انگریزی مال کے خریدنے بلکہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد پہنچانے سے قطعی انکار کر دینا چاہئے۔" (۲)

حسرت موہانی آزادیٔ کامل کا نعرۂ مستانہ اپنی صحافیانہ تحریروں میں بلند کرتے ہیں۔ وہ تلک اور گوکھلے کا سیاسی میدان میں اتباع کرتے ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ سیاسی مبصر ہیں اور ان کی تحریروں میں وقار بلند آہنگی اور بصیرت پائی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کی آزادی کی جنگ کمزور پالیسی یا کسی حد تک گریزپائی کا سبب وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ ان میں تعلیم کی کمی، دوسری قوموں سے رقابت اور آغاز حریت کی قدرتی جھجک پائی جاتی ہے لیکن جب مسلمان ہندوؤں کے برابر ہو جائیں گے تو :

"اس وقت یقیناً وہ طلب حقوق میں بے باک ہو جائیں گے کیونکہ حریت کی خواہش ایک ایسی خواہش ہے جس کی ابتدا ضرور ہوتی ہے لیکن انتہا نہیں ہو سکتی یعنی ایک بار دل میں پیدا ہو کر وہ برابر بڑھتی رہتی ہے گھٹنے کا نام نہیں لیتی۔"(۳)

ہندو مسلم اتحاد کے وہ داعی تھے اور اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے دونوں قوموں کو وہ فہمائش کرتے ہیں :

"بہر حال وطن پرستان ہند کو کسی نہ کسی روز یہ مسئلہ حل کرنا ہوگا۔ ہندوؤں کو

۱- اردوئے معلیٰ، حسرت موہانی علیگڑھ مئی ۱۹۰۷ء ص ۴۰

۲- اردوئے معلیٰ، حسرت موہانی علیگڑھ مئی ۱۹۰۷ء ص ۴۵

۳- اردوئے معلیٰ، حسرت موہانی مئی ۱۹۰۷ء

تو یہ ماننا پڑے گا کہ سلطنت ہند کی عام زندگی میں مسلمان بھی ان کے ہم پلہ ہیں اور مسلمانوں کو علیحدگی کا خبط اور افضلیت کا گمان دماغ سے نکالنا اور ہندوستان کی قوم الاقوام جو مجموعہ ہوگی بہت سی قوموں کا اس کے ایک جزو کی حیثیت سے اپنا جائز رتبے کو قبول کرنا ہوگا۔"(۱)

حسرت موہانی نے اپنی زبان اور قلم کی عصمت ہمیشہ محفوظ رکھی۔ ان کے انداز بیان اور طرز تحریر میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ ایک خوددار اور غیر مند انسان کی طرح وہ اپنے مخاطب سے کلام کرتے رہے اور اپنی مجلاّتی صحافت کو ادب اور سیاست دونوں کے جلال و جمال سے آراستہ کیا۔

شمس بنگالہ

کلکتہ سے ۱۹۰۷ء سے شمس بنگالہ کے نام سے ایک علمی و ادبی ماہنامہ جاری ہوا پھر چھ ماہ بعد محض "شمس" ہو گیا۔ یہ ادبی، علمی اور سیاسی تحریروں سے مزین ہوتا تھا۔ مولوی ذکاءاللہ نے اسے خراج تحسین ادا کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی تھی کہ

"یہ سنگ دلوں میں نرم دلی کے جوہر پیدا کرے۔" (۲)

اس اخبار میں قحط سالی، عوام کی پریشانیاں اور احوال روزگار بھی ہوتے تھے ساتھ ساتھ حکومت انگلشیہ کی حمایت اور انڈین نیشنل کانگریس پر نکتہ چینی بھی۔ یہ اخبار تقسیم بنگال کی حمایت کرتے ہوئے ان ہندوؤں پر تنقید کرتا ہے جو اس کے مخالف تھے۔ اس قضیہ پر کس دلنشین پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے :

۱- اردوئے معلیٰ، حسرت موہانی نومبر ۱۹۰۹ء

۲- شمس بنگالہ مارچ ۱۹۰۸ء ص ۲۶ مولوی ذکاءاللہ بعنوان آفتاب۔

"جب مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی سلطنت کا عروج تھا تو ان کے دارالسلطنت ڈھاکہ کی شان و شکوہ کا ستارہ چمکتا تھا۔ بعد ازاں اس کا ایسا زوال ہوا کہ اس کے حال پر بھی وہ توجہ نہیں کی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ اب حکام نے اس کی پہلی حق تلفی کی مکافات کی۔ بنگالی ہندو اس دارالسلطنت بنانے کو سمجھتے ہین کہ وہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے بنایا گیا ہے۔ وہ گورنمنٹ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے مسلمانوں پر بے جا عنایت و مہربانی کر کے اپنی اس نیکی کو خاک میں ملایا ہے کہ وہ کسی مذہب کی طرفدار نہیں ہے۔" (۱)

اس وقت اردو صحافت پر ادبی رنگ اور انشا پردازی کی ترنگ اس قدر حاوی تھی کہ "شمس" کے مضامین اور شذرات میں ادب لطیف کا مزا آتا ہے۔ مولوی تفضّل حسین فطرت کا مضمون "افلاس ہند" نوبت رائے نظر کا "آخر شاہ اودھ" آغا رفیق بلند شہری کے تاریخی مضامین اور مولوی سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کا مضمون "کھیت کی سیر" دلکش تحریریں ہیں۔ موخرالذکر کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو :

"نومبر کا مہینہ ہے۔ مرچوں کا کھیت کھڑا لہرا رہا ہے۔ کسانیاں اڑاہا کھاڑ اکھاڑ کر پھینکتی جاتی ہیں۔ کشادہ پانی بہ رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پودوں میں ہری ہری مرچیں سبز آویزوں کی طرح لٹک رہی ہیں۔ مرچوں کے پیڑ رنگ برنگ کے بندے کانوں میں ڈالے پتوں کا سہرا باندھے دولہا بنے طرہ لٹکائے کھڑے ہیں۔" (۲)

اس جریدے کے مضمون نگاروں اور قلمکاروں میں شمس العلماء مولوی یوسف جعفری رنجور، عبدالکریم

۱۔ شمس اکتوبر ۱۹۰۸ء ص ۵۸ بحوالہ کاروان صحافت۔ عبدالسلام خورشید، کراچی

۲۔ شمس اگست ۱۹۰۸ء ص ۷۶ بحوالہ کاروان صحافت۔ عبدالسلام خورشید، کراچی

نشتر، امجد حسین شوق، درگا سہائے سرور، مرزا محمد ہادی، عزیز لکھنوی، شاد عظیم آبادی، سلطان احمد جالندھری، ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ حسن نظامی، محمد یحییٰ تنہا جیسے لوگ شامل تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (الہلال والبلاغ کی روشنی میں)

۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنا مشہور زمانہ ہفت روزہ الہلال کلکتہ سے جاری کیا۔ اس سے قبل اردو کے اس بے مثل خطیب وانشاء پرداز نے آغاز حیات ہی سے وادی صحافت کو رہ نوردی کا مشغلہ اختیار کر رکھا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں الصباح کلکتہ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پھر احسن الاخبار میں کچھ دن رہے۔ تحفہ محمدیہ اور خدنگ نظر کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ پھر "لسان الصدق" جاری کیا اور "وکیل" سے بھی وابستہ رہے۔ بالآخر "الہلال" کو عجب آن بان کے ساتھ جاری کیا۔ ۱۶ صفحات کا یہ اخبار اردو صحافت میں ایک نئے باب کا آغاز تھا۔ اس میں مضامین اسلامی ملکوں سے آئے ہوئے مکاتیب اور شذرات وخبریں سبھی کچھ تھا اور نرالے انداز سے تھا۔ یہ باتصویر جریدہ تھا اور خوبصورت ٹائپ میں چھپتا تھا۔ مولانا آزاد نے صحافت کو ایک مشن کے طور پر اختیار کیا تھا۔ انہوں نے الہلال میں اعلان کیا:

> "ہم اخبار کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض الہٰی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں۔" (۱)

گویا مولانا نے صحافی کو ایک مصلح قوم قائد ملت اور رہنمائے ملک کا منصب عطا کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہمارے معاشرہ کے تمام ذہین اور عبقری انسانوں نے یہی روش اختیار کی اور صحافت کے ذریعہ اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ یہ پہلی تربیت گاہ تھی جہاں انہوں نے قوم ومعاشرہ سے مخاطب ہونے کا ہنر

۱۔ الہلال کلکتہ۔ ابوالکلام آزاد ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء

سیکھا۔ یہیں پر ان کو عصری، ملکی اور بین الاقوامی مسائل کا شعور حاصل ہوا اور یہیں پر انہوں نے مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کی بصیرت تک رسائی پائی۔ بقول ڈاکٹر مسکین علی حجازی :

"وہ مسلمانوں کی اصلاح اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے داعی تھے۔ وہ مسلمانوں کو اسلام کی بتائی ہوئی صراط مستقیم پر چلانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے الگ نہیں تھے۔ بلکہ صحیح سیاست مذہب کی پابندی سے وجود پاسکتی ہے۔ الہلال میں مذہب و سیاست معاشیات و نفسیات، جغرافیہ، تاریخ و عمرانیات، سوانح ادب اور حالات حاضرہ پر اعلیٰ قسم کے مضامین اور تبصرے شائع ہوتے تھے۔" (۱)

اس ہفت روزہ میں شبلی، اقبال، حسرت موہانی اور سلیمان ندوی جیسے ممتاز اہل قلم لکھتے تھے۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں اپنی جرأت و بیباکی کی پاداش میں اسے بند کر دیا گیا۔

مولانا آزاد ایک ہمہ جہت اور رنگارنگ صلاحیت اور صفات کے حامل انسان تھے۔ ادب و انشا انکی گھٹی میں داخل تھا۔ ان کی شہرت و عظمت کا نقطۂ آغاز صحافت تھی جس میں ان کی جولانی قلم نے ان کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ مولانا آزاد مزاج کے اعتبار سے اول و آخر صحافی تھے۔ اس شعبہ میں بھی ان کا نقطۂ نظر نہایت اعلیٰ اور معیار حسن نہایت بلند تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں :

"اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہئے۔ چاندی اور سونے کا سایہ بھی اس کے لئے سم قاتل ہے جو اخبار نویس رئیسوں کی ضیافتوں اور

۱- پاکستان وہند میں مسلم صحافت۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی ص ۳۸

امیروں کے عطیوں کو قومی عطیوں، قومی امانت اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نور ایمان کو بیچیں بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر قلندروں کی کشتی کی جگہ قلم دان لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور گلی کوچہ 'قلم ایڈیٹر کا' کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔" (۱)

یہ سچ ہے کہ ممتاز صحافی قطب اللہ کے الفاظ میں :

"ان کے نزدیک صحافت صور اسرافیل ہے جس سے سوتے ہوئے لوگوں کو جگانا ہے نہ کہ اس آواز کو فروخت کرنا اور جلب منفعت کا کاروبار کرنا ہے۔ مولانا کی صحافت اپنے زمانہ کے جدید ترین روشن خیال اور پیش بیں صحافت تھی۔ انہوں نے صحافت کو انقلاب کی آگ بنا کر دوسروں کے دلوں میں لگانے کی جدوجہد کی۔ مولانا کی صحافت ایک مشن تھی۔ انہوں نے صحافتی زندگی کے دوران کبھی کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ مصلحت پسندی کی صحافت کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے کسی کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ کسی کا مذاق نہیں اڑایا۔ ذاتیات کو زیر بحث نہیں لائے۔" (۲)

مولانا جدید ذہن کے انسان تھے۔ انہوں نے اردو صحافت کو جدید تر تکنیک سے روشناس کرایا اور بین الاقوامی سطح کی معلومات مہیا کرائیں۔ انہوں نے اعلیٰ درجہ کی تصویروں سے اخبار کو مزین کیا جو اس زمانہ میں نئی

۱- الہلال۔ ۲۷/جولائی ۱۹۱۲ء

۲- اکادمی۔ اترپردیش اردو اکیڈمی۔ جنوری، فروری ۱۹۸۹ء ص ۸۲-۸۳

بات تھی۔ بقول ڈاکٹر طہٰ حسین :

"ان کی صحافت خود اپنی صحافت تھی جسے خود انہوں نے ایجاد کیا تھا اور جو ان کے ساتھ ختم ہو گئی۔" (۱)

مولانا آزاد کی نثر بڑی بلند آہنگ اور پر شکوہ ہے، اردو صحافت کے لئے یہ لب و لہجہ بالکل نیا تھا۔ اس میں خوش آہنگ فارسی ترکیبیں اور عربی کے فقرے جگہ جگہ بجلی کی مانند کوندتے ہیں۔ مولانا ایک صاعقہ بردوش پیامبر کی طرح صدا لگاتے ہیں گویا سوتوں کو جگا رہے ہوں۔ ان کی نثر میں ایک بلند مرتبہ خطیب کا جاہ و جلال موجود ہے۔ الہلال کے پہلے شمارے کے ذریعہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو ہندوستانی معاشرہ کو اس شان و شکوہ کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں :

"آہ کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اسی ایک صدائے رعد و عصائے غفلت شکن سے سر گشتگان خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کے اٹھو کیونکہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کیونکہ تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے اور تمہیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے۔" (۲)

بقول قطب اللہ:

"مولانا کی صحافت کے تین اہم اصول تھے۔ ۱- اخبارات سماج کے آئینہ دا رہوں۔ ۲- اصلاح معاشرہ ۳- جدید ترین علوم و فنون کا فروغ۔" (۳)

۱- بحوالہ اکادمی۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی۔ جنوری و فروری ۱۹۸۹ء ص ۹۲

۲- الہلال، کلکتہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء ۳- مولانا آزاد کا نظریہ صحافت، قطب اللہ اکادمی، ۱۹۸۹ء ص ۹۴

وہ آج کے صحافیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اظہار افسوس کرتے ہیں :

"ہم میں اب اس کی صلاحیت نہیں ہے کہ آزادانہ طور پر کھل کر اتنے حسین پیرایہ میں کچھ ایسا لکھ سکیں جس سے عوام کو نئی راہ نظر آئے اور ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔" (۱)

مولانا آزاد کی صحافیانہ زبان گو اردو صحافت کی مقبول عام زبان نہ بن سکی۔ یہ رنگ و آہنگ کھنک اور دمک ان کے ساتھ رخصت ہو گئی اور اردو صحافت میں اس سادہ عام فہم، سلیس اور غیر شاعرانہ نثر کو قبول عام حاصل ہوا جو سر سید اور ان کے رفقاء نے تراش خراش کر تیار کی تھی لیکن مولانا ابوالکلام آزاد جو اپنے اسلوب کے موجد اور خود ہی اس کے منتہی تھے۔ اس اعتبار سے یاد کئے جائیں گے کہ انہوں نے صحافت کو پیغمبری کے رتبہ تک پہنچا دیا۔ اب کون ہے جو اس لب و لہجہ میں اپنی قوم کو مخاطب کرے گا :

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں صلہ و تحسین کے لئے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈھتے ہیں۔" (۲)

مولانا آزاد نے ۱۹۱۴ء میں برطانوی سامراج کے ذریعہ الہلال سے ضمانت طلب کئے جانے پر اسے بند کر دیا اور ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء سے البلاغ جاری کیا۔ مولانا نے اس ہفت روزہ میں سیاست کے بجائے تبلیغ و دعوت کے مطمع نظر بنایا اور قرآن حکیم کی مدد سے انہوں نے بالواسطہ نیم سیاسی خیالات کا اظہار بھی کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے یورپ کی صحافت سے اپنی صحافت کو ممیّز کرتے ہوئے لکھا کہ ایک دوکاندار صحافت ہے اور دوسری

۱- مولانا آزاد کا نظریہ صحافت۔ قطب اللہ اکاڈمی ۱۹۸۹ء ص ۹۴

۲- بحوالہ اکادمی جنوری ۱۹۸۹ء ص ۹۴

یورپ کی صحافت ہے جس کا محرک جذبہ تجارت کا ہوتا۔ گاہک کی مرضی کی چیزیں چھاپی جاتی ہیں اور اس کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے تو دوکاندار اور نہ تاجر کو حقیقی صحافی قرار دیتے ہیں بلکہ ان کی صحافت داعیانہ صحافت ہے جس میں سچائی خلوص اور اذعان و یقین کی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا نے الہلال کی اشاعت میں مالی نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے کس نرالے انداز سے رقمطراز ہیں :

"پھر تم اس کی نسبت کیا کہتے ہو جس نے خاک دی اور اس کے معاوضے میں سونا پایا۔ میں نے تین چار سال تک اپنی تبلیغ و دعوت کی تجارت کی اور زخارف دنیوی کی ایک حقیر پونجی اس میں لگا کر کھودی لیکن دیکھو کے خدا نے اس کے معاوضہ میں ہزاروں انسانوں کے دل، لاکھوں مسلمانوں کی روحیں، متعدد بڑی بڑی آبادیاں اور بستیاں ان کے عقائد و اعمال کی تبدیلیاں، صدہا مومنین کاملین اور عباد اللہ مخلصین کی ایمان پرستیاں اور ان سے بڑھ کر یہ کہ کلمہ حق و قرآں کا ایک انقلابی دور عظیم میرے خزانہ اقبال میں کس طرح جمع کر دیا ہے۔" (۱)

البلاغ کے لکھنے والوں میں علامہ اقبال، حسرت موہانی، سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی، وصی بلگرامی، محمد اسماعیل پانی پتی، خواجہ عبد الحئی، شمس اللہ قادری، مصباح الدین وغیرہ شامل تھے۔ اس اخبار میں بھی الہلال کی طرح ایک نیم مزاحیہ کالم "افکار و حوادث" کے عنوان سے ہوتا تھا۔ اس سے خالص شاعرانہ نثر اور اعلیٰ درجہ کا طنز و مزاح چھلکتا تھا۔ مولانا فارسی و اردو کے اشعار اپنی نثر میں ہیرے موتی طرح آویزاں کر دیتے ہیں اور اس سے ان کی عبارت کا حسن اور اس کی معنویت دوبالا ہو جاتی ہے۔ جنوری ۱۹۱۶ء میں مجوزہ شیعہ کالج کا ایک وفد ہز آنر سر

۱- البلاغ کلکتہ، ۱۴/ جنوری ۱۹۱۶ء

جیمس مسٹن کی خدمت میں لکھنؤ میں باریاب ہوا اور نہایت نیاز مندی کے ساتھ ایڈریس پیش کیا۔ اس پر نہایت مرصع ورنگین نثر میں مولانا تبصرہ کرتے ہیں :

"اس وفد نے جو ایڈریس پیش کیا تھا وہ اس قدر دلچسپ نہیں ہے جس قدر ایڈریس کا جواب دلچسپ ہے۔ اور ایسا ہونا ضروری تھا۔ عشق خواہ کسی شکل میں ہو عجز و نیاز کے لئے ہے۔ دلبری ورعنائی کے لئے نہیں۔ یہ خواص حسن کے ہیں۔ اس کا کوئی جلوہ دلربائی و نظارہ پروری سے خالی نہیں ہوتا۔ ہز آنر اپنے جواب میں فرماتے ہیں۔
"اس بیان سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ محمد کو کسی قوم یا مذہب کے لوگوں سے کوئی رعایت منظور ہے۔ نہ میرا منشا یہ ہے کہ جو بڑی بلیغ کوشش اب تک مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی نسبت کی گئی ہیں ان کی بے قدری کی جائے۔ لیکن ہم حیران ہیں کہ اس جملہ کے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ بھلا ایک منٹ کے لئے بھی کوئی عقل مند ہز آنر کی نسبت ایسی بدگمانی کر سکتا ہے؟

پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے   نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے (۱)

بقول ڈاکٹر عبد السلام خورشید 'البلاغ' میں مولانا ایک ایک مضمون "افسانہ ہجر و وصال" ان کے خطیبانہ اسلوب نگارش کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس میں قوم کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ توبہ کر کے ایک بار پھر جادۂ عمل پر گامزن ہوں۔ افسانہ زلف یا مسلم یونیورسٹی اور مجوزہ شیعہ کالج میں واقعات حاضرہ پر نہایت بلیغ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ ۱۲ر مارچ ۱۹۱۶ء کو البلاغ بند ہو گیا۔

۱- البلاغ کلکتہ، ۱۸ر فروری ۱۹۱۶ء

مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار

مولانا ظفر علی خاں نے اپنے والد مولانا سراج الدین احمد کے انتقال کے بعد حیدر آباد دکن سے واپس آکر نومبر ۱۹۰۹ء میں 'زمیندار' کی ادارت سنبھالی۔ اس سے پہلے ان کی صحافیانہ تربیت ان کے والد کے زیر نگرانی ہوئی تھی اور حیدر آباد میں دکن ریویو کے مدیر کی حیثیت سے انہوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے تھے اور 'معرکہ مذہب و سائنس' اور فسانہ لندن کے مترجم کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ جنگ طرابلس کا آغاز ہوا تو زمیندار روزنامہ بن گیا۔ یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس نے مشہور خبر رساں ایجنسی رائٹر سے خبریں حاصل کرنے کا انتظام کیا۔ اس کے ادارتی عملہ میں نیاز فتح پوری، عبداللہ عماری، وحید الدین سلیم جیسے لوگ شامل تھے۔ لطف یہ ہے کہ ظفر علی خاں جتنے بڑے صحافی تھے اسی پایہ کے عالم، خطیب اور شاعر بھی تھے۔ ان کی تقریریں، نظمیں اور ادارتی نوٹ سب درجہ کمال پر تھیں جن کی ملک میں دھوم مچ گئی۔ زمیندار کو عوام میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی جتنی شاید ہی کسی اخبار کو حاصل ہوئی ہو گی۔ ظفر علی خاں نے صحافت کو خطابت طنز و مزاح اور شاعری سے دو آتشہ بنادیا تھا۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ صحافت بہترین ادب ہے جو لوگوں کے جذبات کو اپنی مٹھی میں لے سکتی ہے۔ مولانا محمد علی نے اس کی توصیف میں کامریڈ اخبار میں لکھا :

> "یہ پرچہ اسلئے عروج کو پہنچا کہ ایک ایسے شخص نے اس کی ادارت سنبھالی جو نہایت قابل ہے۔ علیگڑھ کا گریجویٹ ہے۔ ہندوستان کے ایک سے زیادہ صوبوں میں نظم و نسق کا تجربہ رکھتا ہے۔ جدید تمدن اور سیاست سے آگاہ ہے۔ انگریزی کی اعلیٰ قابلیت کا حامل ہے۔ اردو نثر میں ایک درخشاں اسلوب کا مالک ہے اور شعر و شاعری پر اسے کامل عبور ہے۔ اب صورت یہ ہو گئی ہے کہ زمیندار کے مقابلہ میں

دوسرے اخبار پھیکے اور بے مزہ ہوتے ہیں۔" (۱)

اس اخبار کی جرأتمندانہ تحریروں کی وجہ سے اس سے ضمانت طلب کی گئی۔ مسجد کانپور کے حادثہ وقت زمیندار کی بے باکانہ روش پر دوبارہ ضمانت طلب کی گئی۔ مولانا ظفر علی لندن گئے وہاں سے ایک مقابلہ بعنوان ؎

چار چیز است تحفہ لندن　　　　خمر و خنزیر روزنامہ وزن

بھیجا۔ اس مضمون پر دس ہزار کی ضمانت دوبارہ داخل کرنی پڑی۔ پھر جنگ عظیم اول میں ان کو نظر بند کر دیا گیا اور اخبار بھی موقوف ہوا۔

زمیندار برصغیر میں ایک پر جوش اور طوفانی صحافت کا نقیب تھا۔ اس وقت صحافت ادب مذہب سیاست ہر شعبہ علم اور ہر گوشۂ حیات پر خطابت کا غلبہ تھا۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید :

"خطابت اداریہ نگاری کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ خطابت میں وقت کی قید دامن گیر نہیں ہوتی۔ بیان کو طول دیا جاتا ہے کہ کسی لذیذ حکایت کو دراز تر کرنے سے لطف دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ الفاظ کی پھلجھڑیاں بکھرتی ہیں۔ لطائف و ظرائف کے انار چھٹتے ہیں اور اشعار کی قندیلیں روشن ہوتی ہیں لیکن اداریہ نگاری کے لئے ضروری ہے کہ ایک مخصوص موضوع کے اندر رہ کر ہر بات نہایت نچے تلے انداز میں کم از کم الفاظ میں اور منطق کے سہارے کہی جائے۔" (۲)

چنانچہ ناقدین کا خیال ہے کہ مولانا ظفر علی کی خطابت ان کی اداریہ نگاری میں حائل ہو گئی ہے۔ اس کمی کو انہوں نے اپنی صحافتی اور طنزیہ شاعری کے ذریعہ پورا کیا پھر پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں جب سیاسی مسائل پر

۱- کامریڈ، مولانا محمد علی جوہر ۲۲/مارچ ۱۹۱۲ء بحوالہ پاکستان وہند میں مسلم صحافت۔ مسکین علی حجازی۔

۲- کاروان صحافت۔ عبدالسلام خورشید ص ۱۳۲

لکھنے لکھانے پر حکومت نے مکمل پابندی عاید کر دی تو مولانا نے ایک ادبی صحیفہ "ستارہ صبح" ۱۹۱۷ء میں جاری کیا۔ اس ہفت روزہ کو جاری کرنے کی اجازت سر مائیکل اڈوائر گورنر پنجاب نے دی تھی اور مولانا کے حریفوں نے خبر اڑائی کہ برطانوی حکومت سے مولانا نے مفاہمت کرلی ہے۔ مولانا کا اس پر ردعمل ملاحظہ ہو :

"کوئی کہتا ہے کہ ہم نے حکومت کے عطیہ آزادی کے منظور کرنے سے ایک بہت بڑا قومی جرم کیا ہے اور سیاسیات کو دور از کار کہنا ایک اتنا بڑا جرم ہے جس کے کفارہ کی توفیق ہمیں کبھی نہ بخشی جائے گی۔ کسی کا بیان ہے کہ ملک و ملت کی استخواں فروشی کے لئے حکومت کے ساتھ ہماری ایک خاص قسم کی مفاہمت ہو گئی ہے۔ ہم ان کرم فرماؤں کے اس گوناگوں اور بوقلموں حسنِ ظن کا جواب سوائے اس کے اور کیا عرض کر سکتے ہیں کہ یہ عالم بالا کی شعر فہمی کا ایک انداز خصوصی ہے۔"

یہ سچ ہے کہ اس ہفت روزہ میں مولانا نے اپنی ساری شعلہ بیانی کو بالائے طاق رکھ کر تعمیر و ترقی علم و فضل اور ادب و آرٹ کی باتیں اس طرح کرنی شروع کیں کہ انقلاب احوال پر حیرت ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو ایک اداریہ کا اقتباس جس میں راعی و رعایا کے درمیان تعاون کی ضرورت پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے :

"حیات ملیّ کا اصل نمائندہ وہ میلا سا تہمد باندھنے والا دہقاں ہے جسے نہ کڑکڑاتے جاڑوں میں چین ہے اور نہ جھلسانے والی لوؤں میں آرام۔ مینہہ برسے اولے پڑیں جھکڑ چلیں اسے اپنے کام سے کام ہے۔ وہ اگر نہ ہو تو نہ یہ لیگیں ہوں نہ یہ کانگریسیں نہ یہ محل ہوں نہ یہ مینار .... وقت آگیا ہے کہ تمام شکوک و شبہات جو حاکم و محکوم کو ایک دوسرے سے جدا کئے ہوئے تھے اٹھ جائیں۔ وقت آگیا ہے کہ

ایک نیا عہد و پیمان راعی و رعایا کے گہرے تعلقات کی تجدید کرے جس سے اس ملک کی بکھری ہوئی قومیت کا شیرازہ بندھ جائے۔" (۱)

اس ہفت روزہ میں ملک کے نامور اہل قلم کے علاوہ علامہ اقبال کا مضمون بھی نظر آتا ہے۔ غرض ایک سال تک شائع ہونے والا یہ جریدہ علم و ادب کا نادر مخزن ثابت ہوا اور اس نے ادب و صحافت کی طنابیں بحسن و خوبی ملا دیں۔ ستارۂ صبح ۱۹۱۸ء میں بند ہو گیا اور ۱۹۲۱ء میں زمیندار دوبارہ نکلا لیکن کچھ ہی دن بعد وہ ۵ سال کے لئے قید ہو گئے۔ زمیندار میں ان کے اداریئے زیادہ تر سیاسی مسائل پر ہیں جنکی بلند آہنگی اس طوفانی اور انقلابی عہد کے مطابق ہے۔ لیکن بقول عبد السلام خورشید :

"مولانا کے یہاں زیادہ تر منفی اسلوب پایا جاتا ہے یعنی روز آنہ کے مسائل پر چلتی چلاتی باتیں۔ لیکن ان کے غیر سیاسی اداریوں میں مثبت اسلوب پایا جاتا ہے۔ یہ دور "ستارۂ صبح" کی ادارت کا دور ہے۔ "حکومت کے ساتھ تعاون کے عنوان سے وہ لکھتے ہیں :

"اسلامی تاریخ نے ہم کو بھی وہی نصب العین سکھایا ہے جس کی شرح مہلب بن صفرہ کی تاریخ حیات نے کی تھی کہ حکومت کے ساتھ مل کر ملک و قوم کی خدمت کی جائے (رفاہ عام کے کام کئے جائیں) اور جان و دل سے یہ فرض ادا ہو۔ نصب العین تو ہمارا بھی وہی ہے جو مہلب کا تھا البتہ ہم میں اور مہلب میں انقلاب زمانہ کا یہ بڑا تفاوت حائل ہے کہ اس وقت کی اسلامک پبلک نے مہلب کی رفتار کی بالعموم تحسین کی تھی اور ہم پر بے سبب بد ظنی کی جاتی ہے۔" (۲)

۱- روزنامہ ستارۂ صبح۔ ظفر علی خاں لاہور۔ ۸/اگست ۱۹۱۷ء بحوالہ کاروان صحافت عبد السلام خورشید۔

۲- ستارۂ صبح۔ ۸/اگست ۱۹۱۷ء

سرمایہ و محنت کے عنوان سے وہ ملک کے غریب دہقان کو اصحاب دولت امرا اور رؤسا پر ترجیح دیتے ہیں اور ان کی حالت کی اصلاح اور ان کی مدد پر زور دیتے ہیں۔ اوقاف کے انتظام کے معاملہ میں وہ قوم کو بیدار کرتے ہیں کہ اس کا جائزہ لیا جائے کہ ملک میں کتنے مسلم اوقاف ہیں :

"آج تک ہماری کسی کانفرنس اور کسی لیگ اور کسی انجمن سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اوقاف ہند کے متعلق ضروری اعداد و شمار فراہم کر کے ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔ اگر رائے عام اتنی زبردست نہ ہو کہ خائن متولیوں سے باز پرس کر سکے تو پھر حکومت ہی کی خدمت میں ایک پرزور عرضداشت پیش کرے کہ ان گراں بہا اوقاف کے لئے ایک قانون وضع کیا جائے۔ (۱)

اپنے ایک اداریہ میں وہ بدمذاق صحافت کو بے نقاب کرتے ہیں اور قوم کی ثقافتی بدحالی کا بہترین نقشہ کھینچتے ہیں۔ اس میں ان کے قدرت کلام، سحر بیانی، طاقتور اسلوب اور خوش آہنگ نثر کا اندازہ ہوتا ہے :

"کنکوّے اڑانے والے، افیون کی چسکی گھول کر پینے والے، مدک کے چھینٹے اڑانے والے، شاہران شوخ و شنگ سے آنکھیں لڑانے والے، داغ کی غزلوں پر سر دھننے والے، داستان امیر حمزہ اور بیتال پچیسی کی ورق گردانی کرنے والے کیا جانیں کہ ڈارون کس بوزنہ کا نام ہے، رسکن کون مسخرہ تھا اور رینان کون جانگلو ہے۔ اس کا باعث کچھ تو طریقہ تعلیم کا ناقص ہونا ہے اور کچھ صحافت حاضرہ کی بدمذاقی ہے جو جمہور کو اس راستے پر لگاتی ہے۔ ہماری تعلیم بھی ادھوری ہے اور ہم اخبار نویس بھی

۱- ستارۂ صبح۔ ۸/ اگست ۱۹۱۷ء بحوالہ کاروان صحافت ص ۱۴۱

سخت مجہول و نامعقول واقع ہوئے ہیں کہ لوگوں کے مذاق میں تبدیلی پیدا کرنے کی
کوشش نہیں کرتے۔"(۱)

چنانچہ وہ ایک ذمہ دار صحافی کا کردار ادا کرنے کے لئے یہ طے کرتے ہیں کہ ایسے مضامین لکھیں گے جو عام پسند ہونے کے ساتھ ساتھ خاص پسند بھی ہوں۔ یعنی وہ ایسے لب و لہجہ میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں جو سماج کے ہر طبقہ کو اپیل کر سکے۔

مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے دور عروج میں اسے عوام کے دلوں کی دھڑکنوں سے وابستہ کر دیا تھا اور ان کی آواز عوام کی آواز بن گئی تھی۔ مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام کی طرح انہوں نے بھی صحافت کو انقلاب کا ایک وسیلہ بنا دیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک ترک موالات کے زمانہ میں جب وہ گرفتار ہوئے تو یکے بعد دیگر دس مدیر گرفتار ہوتے رہے اور ضمانتوں پر ضمانتیں دی جاتی رہیں مگر حریت و آزادی کی آواز صحافت کے پلیٹ فارم سے بلند ہوتی رہی۔ گرفتار ہونے والوں میں مولانا عبدالمجید سالک، مولوی نذیر احمد، حافظ سید احمد، پنڈت رام سرن، قاضی محمد عدیل عباسی، مولوی فضل محمد خاں، لالہ ڈوگر مل، لال شاہ، حافظ محمد احمد خاں، اللہ داتا وغیرہ تھے۔ گویا اردو صحافت ایک نعرۂ مستانہ بن گئی تھی۔ دیگر اخبارات برطانوی حکومت کے ظلم کو برداشت نہ کر سکے اور بند ہو گئے مگر زمیندار ساری صعوبتیں جھیلتا رہا اور ثابت قدم رہا۔ اس وقت زمیندار کی تحریروں میں جوشیلا اور خطیبانہ انداز پایا جاتا ہے۔ وہ ایک پرجوش خطیب کی طرح کبھی کبھی مسلمانوں کو ملامت کرنے اور زجر و توبیخ کی زبان استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ۱۹۲۴ء میں ہندو مسلم افتراق پر اس نے مسلسل مضامین برائے اتحاد و یگانگت شائع کئے اور انتشار پھیلانے والوں کو للکارتا رہا۔ ایک اداریے میں مسلمانوں کو متوجہ کرتا

۱- ستارۂ صبح۔ ۷ر ستمبر ۱۹۱۷ء بحوالہ کاروان صحافت ص ۱۴۴

ہے:

"ہم نے یہ حقائق گذشتہ تین چار سال کے دوران اس قدر اصرار و تکرار سے بیان کئے ہیں کہ اب انہیں بار بار بیان کرنے سے شرم آتی ہے۔ کیا مسلمان اس قدر سادہ لوح اور کوڑ مغز ہیں کہ ایسی معمولی حقیقت بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتیں؟"(۱)

غرض اردو صحافت کی دنیا میں ظفر علی خاں کا اسلوب منفرد اور طرز تحریر نہایت بلند آہنگ اور شورانگیز ہے۔ انہوں نے جنگ آزادی کا نقیب بن کر اردو صحافت کو رجز میں تبدیل کر دیا۔

مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد

مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے ۲۳ر فروری ۱۹۱۳ء کو روزنامہ "ہمدرد" جاری کیا جو پہلے ۲ صفحات پر پھر ۸ صفحات پر چھپنے لگا۔ اس اخبار سے وہ قوم کے اندر جذبہ حریت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ محمد علی جنگ آزادی کے سورما تھے اور برطانوی سرکار انکو بار بار جیل بھیج رہی تھی۔ ان کی قید و بند کے ایام پر ہمدرد کی اشاعت معطل ہو جاتی تھی۔ اگست ۱۹۱۵ء میں یہ بند ہو گیا اور دوبارہ ۹ر نومبر ۱۹۲۴ء کو جاری ہوا اور ۱۳ر اپریل ۱۹۲۹ء تک جاری رہا۔ ہمدرد نہایت بے باک اخبار تھا۔ اس نے حکومت برطانیہ پر کھل کر تنقید کی۔ ہمدرد نے ملک کے جس حصہ میں یا عالم اسلام میں جہاں بھی استعماری طاقتیں ظلم کر رہی تھیں اس کے خلاف آواز بلند کی۔ اس نے نسلی امتیاز کی مذمت کی اور گاندھی جی کی پرزور حمایت کی۔ ہمدرد کے لب و لہجہ میں ترشی، احتجاج اور طنز شامل ہوتا تھا۔ برطانیہ کے وزیر ایڈورڈ گرے نے مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کیا تو مولانا محمد علی نے ایڈیٹوریل میں تبصرہ کیا:

۱۔ زمیندار، لاہور ۷ر اکتوبر ۱۹۲۴ء

''ہم نے صرف زبانی تشفی اور لفظی تسکین کے ان کے طریقہ عمل میں کوئی
بات ایسی نہیں دیکھی جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ فی الواقع مسلمانوں کے جذبات اور
ان کی خواہشوں کا کچھ خیال کیا جاتا ہے بلکہ بسا اوقات اس کے برخلاف عہدیداران
برطانیہ نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا ہے جس سے صریح اس قلبی
عداوت اور دلی بغض کا ثبوت ملتا ہے جو ان لوگوں کے دلوں میں اسلامی سلطنتوں کی
طرف سے بھرا ہوا ہے۔''(۱)

مولانا محمد علی اپنے شذرات اور تبصروں میں اردو و فارسی کے اشعار کا بھی برمحل استعمال کرتے ہیں :

''گورنمنٹ کو اس غلطی میں نہ پڑنا چاہئے کہ اخبارات سے ضمانت طلب کرنے
یا ان کی ضمانتوں کو ضبط کرنے سے رعایا کے دلوں میں وہ احساسات ضائع ہو سکیں گے
جو حال کے واقعات سے پیدا ہو گئے ہیں ؎

شور بلبل کم نہ گردد گر رود گل از چمن حسن بے بنیاد باشد عشق بے بنیاد نیست''(۲)

محمد علی کی زبان ہمدرد میں نہایت عام سادہ و سلیس ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور فارسی کی ترکیبوں سے پاک صاف ایسی عام فہم زبان جو لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔ ان میں ایک داخلی آہنگ اور لطافت ہے۔ ہمدرد کے ذریعہ مولانا اور ان کے رفقا نے ایک ایسا سکہ بند طرز تحریر اردو کو عطا کیا جو آگے چل کر اردو صحافت کا معتبر اور پسندیدہ اسلوب بن گیا۔ چنانچہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر جو سختیاں ہو رہی تھیں ان پر یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

''اگر یونین جیک کے جھنڈے کے نیچے گورنمنٹ ہند کی نظروں کے سامنے

۱- ہمدرد دہلی، ۱۶راگست ۱۹۱۲ء بحوالہ اکادمی لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۸۹ء

۲- ہمدرد دہلی، ۲۳رستمبر ۱۹۱۳ء بحوالہ اکادمی، لکھنؤ جنوری ۱۹۸۹ء

اور ہماری آنکھوں کے روبرو ہمارے بھائیوں کی تذلیل و تحقیر ہو گی، ہمارے بھائیوں کی بیویوں کی بے حرمتی ہو گی، ہمارے بھائیوں کے بچوں سے جیل خانوں میں چھل پہل کی جائے گی اور صرف اس بنا پر کہ ہم کالے ہیں اور وہ گورے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وزارت کے اقتدار کو اس قدر صدمہ پہنچے گا جس کی تلافی مشکل ہو گی اور اس کے ایسے برے نتائج نکلنے کا اندیشہ ہے جس کو کوئی بھی خواہ مستحسن قرار نہیں دے سکتا۔"(۱)

مہاتما گاندھی کے بارے میں اس اخبار میں یہ ولولہ انگیز تحریر ملاحظہ ہو :

"سرزمین ہند میں کون فرد ہے جو آج سپہ سالار حق و صداقت کے نام نامی سے واقف نہیں۔ یہ وہ فخر ہند نوجوان ہے جو مادر وطن کی عزت و جائز احترام برقرار رکھنے کی خاطر آج تیسری بار جنوبی افریقہ کے جیل خانوں میں وہاں کی گوری آبادی کے ہاتھوں مظلومیت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔" (۲)

اپنے دوسرے دور میں بھی ہمدرد اپنی اسی تیزی طراری، شوخ کلامی اور جرأت گفتار پر برقرار رہا۔ اس کے شذرات کا عنوان مولانا ماجد کے سچ کی طرح فارسی یا اردو کے چبھتے ہوئے اشعار یا مصرعے ہوتے ہیں۔ مثلاً گاندھی جی کے ۱۹۲۴ء میں بلگام کی کانگریس کے خطبہ صدارت کو پیش کرتے ہوئے عنوان لگایا .... ہر چہ بہ قیمت کہنہ بہ قامت بہتر ...... "زندہ باد گاندھی' کے عنوان سے ان کی کانگریس میں کامیابی پر اظہار مسرت کیا۔ لارڈ لٹن کے ایک خطرناک ایکٹ کی مخالفت کرتے ہوئے شذرے کا عنوان تھا :

۱- ہمدرد ۲/اکتوبر ۱۹۱۳ء۔ بحوالہ اکادمی، لکھنؤ جنوری-فروری ۱۹۸۹ء

۲- ہمدرد ۱۳/دسمبر ۱۹۱۳ء۔ بحوالہ اکادمی، لکھنؤ جنوری-فروری ۱۹۸۹ء

"خلقے بہ منت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف"

مولانا محمد علی کے قلم میں زبردست روانی اور توانائی ہے۔ بقول صباح الدین عمر اس اخبار نے تحری آزادی کے ہر موڑ پر عوام کو جدوجہد آزادی کی دعوت کی تھی۔ آزادی کی آواز بلند کرنے میں اس نے قید و بند کا خوف نہ کیا نہ دار و رسن سے ڈرا ر" (۱)

قاضی عبد الغفار کا جمہور

جنگ آزادی کے نقطہ عروج پر کلکتہ سے ایک اردو اخبار منجھے ہوئے صاحب قلم اور پختہ کار صحافی قاضی عبد الغفار کی ادارت میں جنوری ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس اخبار نے غیر ملکی ظلم و تشدد کے خلاف پر خروش صدائے احتجاج بلند کی۔ اس کے مدیر شہر قاضی عبد الغفار اس سے پہلے محمد علی کے مشہور اخبار "ہمدرد" میں کام کر چکے تھے۔ وہاں ان کے رفقائے کار میں مولانا ظفر علیء عبد الحلیم شرر اور جالب دہلوی جیسے ممتاز اہل قلم شامل تھے۔ سری نواس لاہوتی کے مطابق

"یہ اخبار قاضی صاحب نے مولانا محمد کے اشارے پر شائع کیا۔" (۲)

چنانچہ "جمہور" ہمدرد کا ایک دھندھلا سا عکس محسوس ہوتا ہے۔ جمہور کو اس کی بے باکی اور جرأت گفتار کی وجہ سے انگریزی حکومت سے ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۸ء کو بند کر دیا۔ عابدہ سمیع الدین کے الفاظ میں :

"قاضی صاحب مولانا محمد علی کے تربیت یافتہ تھے اور ہمدرد میں ان کے ساتھ کام کر چکے تھے اس لئے انہوں نے 'الہلال' و 'ہمدرد' کی اعلیٰ صحافتی دیانتداری کو ایک نیا اعتبار عطا کیا۔" (۳)

۱- مقدمہ انتخاب ہمدرد۔ دہلی بحوالہ اکادمی جنوری ۱۹۸۹ء

۲- قاضی بعد الغفار۔ سری نواس لاہوتی ہماری زبان انجمن ترقی اردو۔ دہلی یکم ستمبر ۱۹۸۵ء

۳- اخبار جمہور۔ پروفیسر عابدہ سمیع الدین، دریا گنج دہلی ۱۹۹۵ء ص ۱۳

قاضی صاحب کی صاف گوئی اور استبداد کے خلاف صدائے انقلاب نے اس اخبار کو بے حد مقبولیت عطا کی۔ اس کی اشاعت ۱۲ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کی عوامی مقبولیت میں بہر حال اس کی عام سلیس اور رواں زبان کو بھی دخل ہے جس نے اسے ہر دل عزیز بنادیا۔ قاضی صاحب اردو کے ایک سکہ بند ادیب وانشاپرداز تھے۔ ان کی نثر میں ادب لطیف کی چاشنی اور شاعرانہ حلاوت موجود ہے۔ سنسر کی زیادتیوں پر طنز کا بھرپور وار کرتے ہوئے قاضی صاحب رقمطراز ہیں :

"اخبار نویسی اس عہد انقلاب و آفات میں ایک گناہ ہے جس کے دھبے دامنوں اور جس کے داغ پیشانیوں پر ایک دفعہ اپنا نقش بٹھا لیتے ہیں تو پھر کبھی نہیں مٹتے۔ اس عرصہ دار و گیر میں اس گناہ کے لئے کبیرہ و صغیرہ کا امتیاز نہیں۔ در توبہ بند ہے اور عذاب کے فرشتے سر پر سوار ہیں۔ اس ہفت خواں کا مسافر ایک ایک قدم جس مشکل سے اٹھاتا ہے اس کی لذت کوئی ہمارے دل سے پوچھے۔ ہمدرد کے کالموں میں یہی قلم جب سنسر کی موشگافیوں سے تنگ آکر چڑیا چڑے کی کہانی لکھتا ہے تو وہ بھی بارگاہ سنسر سے مسترد ہو جاتی ہے اس لئے کہ یوں تو کچھ معلوم نہیں ہوتا مگر خدا جانے ان سادہ الفاظ کے اندر آپ نے کیا بھر دیا ہو۔" (۱)

قاضی صاحب کے صحافیانہ اسلوب پر مولانا آزاد کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ اس وقت کی صحافت پر عام طور سے خطابت کا سایہ تھا۔ قاضی صاحب کی تحریروں میں خطابت کی دھوپ چھاؤں ملاحظہ ہو۔ عنوانات وہ بھی اپنے معاصرین کی طرح اشعار یا مصرعوں سے قائم کرتے ہیں۔ ایک اداریہ کا اقتباس ملاحظہ ہو :

۱۔ بحوالہ اخبار جمہور۔ پروفیسر عابدہ سمیع الدین ص ۱۶

”تب چاک گریباں کا مزہ ہے دل نالاں

اگرچہ فریادیں کرتے کرتے گلے پڑ گئے۔ چیختے چیختے حلقوم تھک گئے۔
ہندوستان کی حالت پر آنسو بہاتے بہاتے آنکھیں خشک ہو گئیں مگر ہمیں حکومت کو
تو بتادینا چاہئے کہ بازوئے عمل ابھی نہیں تھکے اور وادی پر خار میں قدم چلنے سے بیکار
نہیں ہوئے۔“ (۱)

کبھی کبھی وہ داستانوں جیسا اسلوب اختیار کرتے اور تشبیہات واستعارات وتمثیلات کی جھڑ لگا دیتے ہیں۔
اردو صحافت کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اسے اس قدر بلند پایہ انشاء پرداز وفنکار ہاتھ آئے جنہوں نے صحافت کو ادب
لطیف اور ادب عالیہ کی بلندیوں تک پہنچادیا۔

عابدہ سمیع اللہ جمہور کے اداریوں کا انتخاب مرتب کرتے ہوئے بجاطور پر لکھتی ہیں :

”آج دلوں میں بڑھتی ہوئی منافرت کی چہار طرف پھیلی ہوئی تاریکیوں میں
روشنی کے ان میناروں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اکیسویں صدی کی طرف تیزی سے
بڑھتے ہوئے قدموں کے لئے وقتاً فوقتاً پیچھے مڑ کر ان راستوں پر بھی نظر ڈالنا
ضروری ہے جو ہمارے اسلاف اپنی ان گنت قربانیوں سے ہمارے لئے ہموار کر گئے
ہیں۔“ (۲)

غرض قاضی عبدالغفار پر اردو صحافت ہمیشہ ناز کرے گی جنہوں نے اسے ایک خوش آہنگ دلکش اور دلنواز
اسلوب عطا کیا۔

۱- اخبار جمہور۔ پروفیسر عابدہ سمیع الدین ص ۱۷

۲- اخبار جمہور۔ پروفیسر عابدہ سمیع الدین ص ۲۱

مولانا عبدالماجد دریابادی (سچ وصدق کی روشنی میں)

۲/ جنوری ۱۹۲۵ء کو لکھنؤ سے اخبار "سچ" کا اجرا ہوا جو ہفتہ وار تھا اور جس کے اڈیٹر شروع میں ظفر الملک تھے۔ ایک سال بعد مولانا عبدالماجد دریابادی نے ادارت سنبھال لی۔ پھر تھوڑے وقفہ تک بند رہنے کے بعد یہ ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔ پھر چند سال بعد "صدق" کے عنوان سے اسکا اجرا ہوا۔ بعد میں ملک آزاد ہونے کے بعد یہ صدق جدید ہو گیا۔ یہ اردو زبان کے چوٹی کے اخباروں میں شمار ہوتا تھا۔ اور صحافیانہ نقطۂ نظر سے اسے اودھ پنچ، الہلال، زمیندار کے رتبہ کا اخبار سمجھا جاتا تھا۔ اس کی قومی و ملی خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات بھی امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ اس کے مدیر مولانا عبدالماجد دریابادی ایک ممتاز صاحب قلم تھے اور اردو نثر میں صاحب طرز ادیب شمار کئے جاتے تھے، جن کی نگاہ صحافت کے ساتھ سیاست، اسلامیات، فلسفہ اور ادبیات مشرق و مغرب پر گہری تھی اور اردو کے کثیر التصانیف ادیب ہیں جنہوں نے مختلف علوم پر اپنی حکمرانی کا سکہ چلایا۔

بقول شمس بدایونی :

> "وہ قدیم و جدید علوم سے نہ صرف بہرہ ور تھے بلکہ ان علوم کے ذریعہ انہوں نے علمی و ادبی اسرار و معارف کی اس طور پر بازیافت کی کہ ادب فی الواقع زندگی کا سرچشمہ نظر آنے لگا۔" (۱)

اس اخبار کا اجرا سچ کا پیغام پہنچانے اور سچائی کی تلاش کرنے نیز عملی زندگی میں اس کے نفاذ کی راہ ہموار کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا اور یہی اچھی صحافت کا پہلا زینہ ہے۔ ظفر الملک نے اس کے اجرا کے وقت لکھا تھا کہ اسکی غرض اشعت یہ ہے کہ ایک آزاد اور بااصول اخبار کم سے کم مسلمانوں میں صحیح خیالات کی اشاعت کے

۱- دوماہی اکادمی۔ اردو اکاڈمی لکھنؤ جولائی-اگست ۱۹۸۸ء

لئے جاری کیا جائے۔ اس اخبار میں بالعموم مختصر اور انشائیہ نما تحریریں چھپتی تھیں۔ اس کے خوشگوار مقاصد میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ہندوؤں مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس اخبار کی شہرت کا موجب اس کے شذرات کا کالم تھا جو "سچی باتیں" کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ اس کالم میں مولانا عبد الماجد کے قلم کی شوخی، ندرت بیان اور بہترین و دلکش و شگفتہ نثر کا انداز پڑھنے والوں کو مسحور کر لیتا تھا۔ بقول عبد الاحد خاں خلیل :

"ان کے ادبی تنقیدی اور تہدیدی انشائیے جو سچی باتوں کی صورت میں انکے سچ، صدق اور صدق جدید کی ہفتہ وار اشاعتوں میں محفوظ ہیں ان کے حسن انشاء اور آہنگ فکر کے شاہد و امین ہیں۔ ان کے احساس کی شدت جذبات کی گہرائی ان کی تحریروں میں تاثیر اور استواری پیدا کر دیتی ہے اور ان کی سچی باتیں بصیرت افروزی اور عبرت آموزی کا مرقع بن جاتی ہیں۔" (۱)

مولانا عبد الماجد سچ اور صدق میں سیاسی، معاشرتی و تہذیبی انداز کی خبروں کو مختصر اُشائع کرتے تھے اور ان میں طنز کی ہلکی پھلکی چٹکیاں لیتے تھے اور ہر خبر سے عبرت و نصیحت کا کوئی پہلو نکال کر لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں :

"واقعات حاضرہ پر اس طرز خاص سے تبصرہ کرنا کہ پہلے نفس خبر بجنسہ نقل کر دی اور پھر اس پر مختصر جچے تلے لفظوں میں کچھ لکھ لکھا دیا۔ صدق و سچ سے پہلے اردو کی دنیائے صحافت کے لئے نامعلوم تھا۔" (۲)

۱- مضمون انشائے ماجدی کا حسن و آہنگ مشمولہ عبد الماجد نمبر نیا دور لکھنؤ، اپریل - مئی ۱۹۷۸ء

۲- آپ بیتی۔ عبد الماجد دریابادی ۲۱۶

سچ کے قلمکاروں میں اس عہد کے جو ممتاز اہل قلم اور اصحاب نظر شامل تھے ان میں مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام، مولانا سلیمان ندوی، قاری شاہ محمد جعفری ندوی اور ابو الجلال ندوی، عبد السلام ندوی، راشد الخیری، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نمایاں ہیں۔ صحافت کا رنگ و روغن اس وقت نکھرتا ہے جب اس میں احتجاجی، مناظرانہ اور مناقشانہ تحریریں چھپتی ہیں۔ مولانا عبد الماجد کا قلم بھی اس میدان میں جولانی دکھاتا ہے۔ نیاز فتحپوری سے ان کے علمی مناقشہ کو اردو ادب و صحافت کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ مولانا نے نیاز کے جگر خراش حملوں کا ایسا جواب دیا کہ بالآخر ۳۱/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو نیاز کے لئے اپنا توبہ نامہ شائع کرانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ مولانا نے ۱۹۳۳ء میں سچ کے بند ہونے پر جو ۲ سال بعد صدق کی شکل میں ۱۹۳۵ء میں منظر عام پر آیا ان سطور میں اپنی خدمات کا تعارف کرایا ہے :

> ”سچ کو اپنی زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ آج اس سے جنگ ہے تو کل اس سے۔ شروع شروع تنوجہ اصلاح رسوم اور رد بدعات پر زیادہ تھی۔ پھر بعض اور طبقوں کی دشمنی مول لینا پڑی۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں تو اس نے نیاز فتحپوری کے الحاد اور فتنہ نگار کے مقابلہ کے لئے مہینوں وقف رکھا۔ زبان شروع شروع میں ”عوامیت“ کی سطح پر قصداً لے آئی گئی تھی یہاں تک کہ اس کی اردو پر لوگوں نے پھبتی کانگریسی اردو کی کس ڈالی۔ بعد کی زبان شستہ اور نستعلیق اختیار کرلی گئی۔ صدق نے طنز و تعریض کا استعمال بے شک کثرت سے کیا ہے لیکن اپنی کوشش ہمیشہ ذاتیات کا پہلو بچا کر اور صرف پبلک زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھ۔ ہر حق کو حق اور ہر باطل کو باطل کسی پارٹی کے خیال اور بغیر کسی تعصب اور تحزب کے پیش نظر کیا۔

اظہار رائے اور جنبش قلم میں یہ کس منہ سے کہوں کہ کبھی بھی ذاتی جذبات سے

متاثر نہیں ہوا ہوں............" (۱)

چند دیگر اخبارات

روزنامہ سیاست لاہور

یہ اخبار ۱۹۱۹ء میں لاہور سے مولانا سید حبیب کے اہتمام سے شائع ہوا۔ یہ اخبار تحریک خلافت اور ترک موالات کا زبردست حامی تھا۔ یہ قومی احساسات اور امنگوں کی بخوبی ترجمانی کرتا تھا۔ انگریزی اقتدار نے اسے بار بار ضمانت جمع کرنے پر مجبور کیا اور سنسر کے شکنجے میں بھی جکڑنے کی کوشش کی مگر یہ بانکپن اور جرأت اظہار پر قائم رہا۔ مولانا سید حبیب بھی دیگر رہنماؤں کی طرح ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوئے۔ وہ اپنے ہم عصروں کی طرح ادیب و انشاء پرداز نہیں تھے اور سادہ سودہ نثر میں اظہار خیال کرتے تھے جب کہ ان کے عہد میں اعلیٰ درجہ کے نثر نگار صحافت کے گلشن میں گل بوٹے کھلا رہے تھے اسلئے اخبار سیاست زیادہ نمایاں نہ ہو سکا اور انیس سال جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔

مسلم گزٹ

یہ اخبار بیسویں صدی کے آغاز میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس اخبار اور اس کے مدیر وحید الدین سلیم کی خدمات کو الہلال کے صفحات پر سراہا ہے۔ لکھتے ہیں

۱- آپ بیتی۔ مکتبہ فردوس لکھنؤ ص ۲۲-۲۲۱

"در حقیقت موجودہ تغیرات کے ذکر میں سب سے زیادہ خصوصیت کے ساتھ مسلم گزٹ لکھنؤ کا ذکر آنا چاہئے۔ جس نے موجودہ سیاسی تغیرات وخیالات کی تولید میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ اس خداپرستانہ دلیری اور حق گویانہ آزادی کے ساتھ صدا بلند کی کہ فی الحقیقت لا یخافون لومۃ لائم کے نفوس خاص میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ہم اپنے مخدوم دوست سے متمنی ہیں کہ اپنے قلمی جہاد کو اور زیادہ محکم وشدید کریں۔ وہ یقین کریں کہ حق وسچائی کے لئے فتح ہے۔ باطل اور باطل پرستی کے لئے نہیں کہ اِن الباطل کان زھوقا......" (۱)

یہ اخبار مولانا آزاد کے الہلال کے معاصر تھا۔ مولانا کو اس کے بند ہونے پر بہت صدمہ ہوا اور اس کے مالک میر جان صاحب کو جو حکومت کی دھمکی میں آگئے مولانا نے کافی زجر وملامت کی۔ انہوں نے پرجوش اور خطیبانہ انداز سے اس عہد میں صحافت کی پتوار تھامنے والوں کو پیغام دیا:

"سمندر طغیانی پر ہے۔ موجیں پہاڑ کی چوٹیوں تک اچھل رہی ہیں۔ آسمان پر سے ایک دوسرا سمندر ہے جو بہہ رہا ہے۔ پھر اگر کشتی چلانے والے ہوں گے تو اسی حالت میں چلا کر کنارے پہنچادیں گے۔ ان کے لئے ایک پرسکون وپرامن سمندر نیا نہیں پیدا کیا جائے گا۔" (۲)

مدینہ

یہ اخبار ۱۹۰۲ء میں بجنور سے سہ روزہ کی صورت میں جاری ہوا اور اس کے مدیر حامد انصاری تھے۔ اس

۱- پاکستان وہند میں مسلم صحافت ص ۲۹

۲- مولانا آزاد کا نظریہ صحافت، مرتب قطب اللہ، اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ ص ۱۱۴

اخبار کا معیار صحافت ادبی اعتبار سے خاصا بلند تھا اور اس سے کافی بلند و بالا ہستیاں وابستہ رہیں۔ یہ اخبار متانت اور دلائل کے بغیر کوئی بات نہیں کہتا تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اسکی پالیسی سے اختلاف کرنے والے بھی اس کا مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ اس اخبار نے طویل عمر پائی اور بیسویں صدی کے بڑے حصہ تک جاری رہا۔ اسکی ادارت ایک مدت تک ممتاز صحافی ملک نصر اللہ خاں عزیز کے ہاتھوں میں رہی۔ ان کے بعد محمد عثمان فارقلیط مدیر مقرر ہوئے۔ مدینہ نے زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے شستہ سلیس اور لطیف نثر کو فروغ دیا۔

زمانہ

منشی دیانرائن نگم نے زمانہ ۱۹۰۳ء میں جاری جو ادبی اور صحافتی دونوں پہلوؤں سے اردو کا ایک ممتاز جریدہ تھا۔ اس رسالہ کے قلمی معاونین میں بڑی تعداد میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شامل تھے۔ چکبست، سید سلیمان ندوی، عزیز مرزا، عبد الماجد دریابادی اس میں برابر لکھتے تھے۔ زمانہ کے لکھنے والوں پر سر سید کی علیگڑھ تحریک نثر نگاروں کا رنگ غالب تھا۔ اس رسالہ نے مدت دراز تک اردو نثر کو شاداب بنایا۔ اس کے خاص نمبروں کی وجہ سے ملک میں اس کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس رسالہ نے اردو کے سیکولر کردار کو نمایاں کیا اور لکھنے والوں کی ایک پوری نسل کی اس نے تربیت کی۔

باب چہارم

۱۹۲۱ء سے آزادئ ہند ۱۹۴۷ء تک اردو صحافت کے اسالیب

بیسویں صدی کی دوسری دہائی پہونچتے پہونچتے اردو صحافت کی دنیا میں کچھ نئے انقلابات آچکے تھے اور کچھ کے لئے ماحول سازگار ہو رہا تھا۔ صحافتی ادب اور ادبی صحافت میں فرق واضح ہونا شروع ہو چکا تھا۔ صحافیوں کا ایک گروہ صحافت کی ادبی سطح قائم کرنے پر مصر تھا، دوسرا گروہ جو بنیادی طور پر ادیب و شاعر نہیں تھے اور صحافی پہلے تھے۔ ادیب یا شاعر بعد میں۔ وہ سیاسی اور معاشرتی مقصد کے لئے صحافت کو اپنا رہے تھے۔ ایک گروہ اسلوب کو نکھارنے سنوارنے اور اسے ادبی فضا سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے نزدیک صحافت ادب کی اشاعت کا بہترین ذریعہ ہے۔ دوسرے گروہ کے ہاں اسلوب کی جدت ضرور ہے مگر صحافت کی عام اور سادہ روش ملتی ہے۔ اس دور کی نمایاں خصوصیت مجلّاتی صحافت کی ترقی اور اردو ادب کا فروغ ہے۔

اس دور کی صحافت کی زبان پرجوش جارحانہ اور چونکا دینے والی ہے اور صحافت کا جو اسلوب پہلے وجود میں آچکا تھا اس پر ادب نے دوبارہ یورش کر دی۔ ایک مرتبہ پھر صحافتی اسلوب کی جگہ ادبی اسلوب نے لے لی۔ اردو صحافت نے خلافت اور عالم اسلام کے دوسرے مسائل اٹھا کر اسلامی دنیا سے ایک نیا رشتہ قائم کیا۔ اردو صحافت میں جذبات نگاری کا راستہ کھل گیا، پرشکوہ الفاظ، بلند آہنگ تراکیب، عربی و فارسی کے الفاظ اشعار سے اردو پر غلبہ کر لیا۔ اس دور کی صحافت بڑی حد تک ادبی رنگ لئے ہوئے تھی۔

اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں کی صحافت کی طوطی بول رہی تھی اور صحافت کی زبان میں وہی طمطراق باقی تھا۔ پرجوش چوکا دینے والا لہجہ، نئی تراکیب اور ایک حد تک قافیہ پیمائی لیکن جیسے جیسے زمانے میں تبدیلیاں ہوتی گئیں، زبان بھی بدلتی گئی اور اسلوب میں تبدیلی آتی گئی۔

ہندوستان کی تاریخ میں دوسری دہائی کا آخری سال بڑا تاریخی اور اہم سال تھا۔ انگریزوں نے اس سال ہندوستانیوں پر جو ظلم ڈھائے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آزادی کے پروانوں نے بے دریغ قربانی دے کر

ایک انوکھی مثال قائم کر دی۔ اس سال آگ کی جو چنگاری پھیلی اس نے اپنا دور رس اثر دکھایا۔ امر تسر میں جلیاں والا باغ سانحہ اسی سال ۱۳؍اپریل کو ہوا جس میں جنرل ڈائر نے ہزاروں نہتھے ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سال کئی روزمانہ ہفتہ وار اور پندرہ روزہ اخبار منظر عام پر آئے اس میں روزنامہ پرتاپ، سیاست، کانگریس اور بہت اہم اخبار تصور کئے جاتے تھے۔ پرتاپ ۳۰؍مارچ ۱۹۱۹ء کو لاہور سے جاری ہوا اس کو شری کرشن نے جاری کیا۔ وہ کٹر نیشنلسٹ تھے۔ جب پرتاپ جاری ہوا تو پنجاب میں سیاسی بے چینی کا دور تھا چونکہ پرتاپ قومی نظریہ کا حامی تھا اس لئے اس کو نکلے ابھی چند روز ہوئے تھے کہ ۱۸؍اپریل ۱۹۱۹ء کو کرشن گرفتار کر لئے گئے اور پرتاپ بند ہو گیا۔ وہ ۱۹۲۰ء میں رہا ہوئے تو پرتاپ پھر جاری ہوا لیکن دو مہینے بعد اس کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔

پرتاپ کی زبان معیاری نہیں تھی۔ ہندی اور پنجابی کے الفاظ اردو رسم الخط میں نظر آتے ہیں حتیٰ کہ ہندی تراکیب اور اصلاحات پے در پے استعمال کی جاتی تھیں۔ پنجابی بولی اس کی تحریر کا خاصہ لگتی ہے۔ اس کی وجہ بھی ہے کہ یہ پنجاب کے ایک مخصوص طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اردو رسم الخط کا اخبار زیادہ لگتا ہے اور واقعی اردو کا اخبار کم۔ تقسیم کے بعد یہ دہلی سے شائع ہونے لگا پھر جالندھر سے بھی۔ یہ آج بھی دہلی سے شائع ہو رہا ہے۔

روزنامہ کانگریس بھی اسی سال سال دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے مدیر مولانا عارف اور مالک و منتظم لالہ شنکر لال تھے۔ یہ اخبار کانگریس کا ترجمان تھا۔ جون ۱۹۱۹ء میں اس پر پابندی لگی اور دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی اور اخبار بند ہو گیا۔ مولانا عارف اس سے قبل "انقلاب" میں کام کر چکے تھے۔ وہ معروف صحافی کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ انہیں کی تحریر کی بدولت کانگریس نے جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کی سادہ

اور دل کو چھو جانے والی طرز تحریر نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ اس میں سیاسی معاملات میں زوردار بحث کی جاتی تھی۔ اس کی مقبولیت کا خاص سبب یہی تھا لیکن جلد ہی یہ اخبار بند ہو گیا۔

اسی سال ایک دو اور بہت اچھے اخبار نکلے ان میں لکھنؤ کے "ریفارمر" اور "حقیقت" قابل ذکر ہیں۔ حقیقت اکتوبر ۱۹۱۹ء میں نکلا۔ اس کے ایڈیٹر انیس احمد عباسی تھے۔ ریفارمر لالہ ہردیال نکالتے تھے۔ علیگڑھ میگزین جنوری ۱۹۲۰ء میں مسلم یونی ورسٹی سے جاری ہوا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر رشید احمد صدیقی تھے۔ رشید احمد صدیقی کے بعد یونی ورسٹی کے طلبا اس کے ایڈیٹر ہوئے۔ خواجہ منظور حسین، آل احمد سرور، جاں نثار اختر، ابو اللیث صدیقی، آفتاب احمد صدیقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، قمر رئیس اور شہریار میگزین کے ان ایڈیٹر میں ہیں جنہوں نے اردو ادب میں شہرت حاصل کی۔

اسی سال اہم اخبار بندے ماترم شروع ہوا۔ اس کو لالہ لاجپت رائے نے جاری کیا تھا۔ یہ پہلا اردو اخبار تھا جو کثیر سرمایہ سے کسی کمپنی کے تحت شروع کیا گیا تھا۔ اس کی ادارت سردار موہن سنگھ اور رام وفا کرتے تھے چونکہ یہ کمپنی کے تحت شروع ہوا تھا اور انتظامی امور بہتر تھے اس لئے ابتدا ہی سے اخبار نے صحافت کے سارے اصول و ضوابط کی پابندی کی۔ ابتدا ہی میں اس کی اشاعت تقریباً دس ہزار تھی۔

۱۹۲۱ء میں ضلع بجنور کے قصبہ نگینہ سے "الامان" جاری ہوا۔ مولانا مظہر الدین نے اس کو شروع کیا جنہوں نے ۱۹۱۹ء میں بجنور سے ہفتہ وار "دستور" جاری کیا تھا۔ اس کے مدیر شاہ امان اللہ تھے۔ اس نے بہت جلد شہرت کی منزلیں طے کرلیں۔ اس کی شہرت اور معیار سے متاثر ہو کر حکیم اجمل خان نے اس کو دہلی منتقل کروایا یہاں آکر یہ سہ روزہ ہو گیا۔ تقسیم ملک تک دہلی سے شائع ہوتا رہا پھر کراچی منتقل ہو گیا۔

لاہور سے لالہ شام لال کپور نے ۱۹۲۱ء میں کیسری نکالا۔ اس سے قبل وہ گرو گھنٹال نام کا ایک اخبار نکال چکے

تھے۔ یہ اخبار بنیادی طور پر ہندوؤں کے مفادات کی ترجمانی کرتا تھا اور بہت جلد اس کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔

اس سال کلکتہ سے ایک اخبار "پیام" جاری ہوا۔ اس کے مدیر مولانا ابوالکلام آزاد اور نائب مدیر مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی تھے۔ پہلے شمارہ میں مولانا آزاد نے مولانا شوکت علی اور محمد علی کی گرفتاری پر یہ لکھا :

"تم سے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تھوڑا سا سامان، تھوڑی سی جسمانی راحت، تھوڑی سی وہمی اور خیالی آرائش تمام تر غفلت و نفس پرستی اسی مقصد کی راہ میں قربان کردو۔ سودیشی کا عہد، بائیکاٹ کی تکمیل، ترک موالات کی سچی تعمیل، مجاہدین انگورہ کی مالی اعانت گناہ و عصبیت سے دل کی پاکی اور خدا و شریعت سے کامل اطاعت کا رشتہ یہی ان گرفتاران حق کی قربانی کی اصل قیمت ہے جو ملک کو ادا کرنی ہے۔" (۱)

اسی شمارہ میں مولانا نے تفصیل سے ترک موالات کا فلسفہ بیان کیا تھا اور لوگوں کو تلقین کی تھی کہ وہ جرأت واستقامت اور عدم تشدد کے اصول پر کاربند رہتے ہوئے تحریک کو جاری رکھیں۔

نیاز فتحپوری نے ۱۹۲۲ء میں علمی، ادبی اور تاریخی رسالہ "نگار" جاری کیا۔ یہ پہلے آگرہ میں چھپتا تھا۔ دہلی سے ڈاک کے ذریعہ تقسیم ہوتا تھا۔ اس اخبار نے ان اردو ادیبوں اور شاعروں کو متعارف کرایا جو بعد ازاں اردو کے بہت بڑے ادیب و شاعر اور اسکالر ہوئے اور غیر ادبی حلقوں میں بھی شہرت و تحسین حاصل کی۔ لیکن نیاز فتحپوری کا روز اول سے ہی یہ ارادہ تھا کہ رسالہ کو خالص ادبی نہیں بننے دوں گا۔ اسی لئے انہوں نے اس میں ہر طرح کے مضامین و تخلیقات شائع کیں۔ ۱۹۲۳ء میں اس کا دفتر آگرہ سے بھوپال منتقل ہو گیا۔ نگار کے بہت سے ایسے خصوصی نمبر ہیں جو آج بھی اپنی افادیت کی بدولت اردو ادب کے قاری کی توجہ کے مرکز ہیں۔ نگار میں عام

---

(۱) تاریخ صحافت اردو (جلد پنجم) امداد صابری۔ صفحہ ۲۴۲

قاری اور غیر ادبی قاری کے لئے بھی دلچسپی کے سامان فراہم کئے جاتے۔ اس کی زبان میں سادگی اور سلاست کا خاص خیال رکھا جاتا۔ اس کے علمی و ادبی مضامین کی زبان صاف ستھری اور عام فہم ہے۔

آریہ سماجی نقطہ نظر کی ترجمانی کرنے کے مقصد سے ۱۳/اپریل ۱۹۲۳ء کو لاہور سے "ملاپ" شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مہاشہ خوشحال چند خورسید تھے۔ اس وقت اخبار چونکہ مشن کے طور پر شروع کئے جاتے تھے، حصول آزادی کی جدوجہد جاری تھی اس لئے اخبار بیک وقت آریہ سماجیوں کی فلاحی تنظیموں اور حصول آزادی دونوں کے لئے وقف تھا۔

اسی سال دہلی سے تیج جاری ہوا۔ اس کے بانی سوامی شردیانند اور مدیر دیش بندھو گپتا تھے۔ یہ بھی آریہ سماجیوں کا اخبار تھا لیکن جارحانہ رخ اختیار کئے ہوئے تھا۔ اس نے فرقہ وارانہ رویہ بھی اختیار کیا۔ اس دہائی میں دیوان سنگھ مفتون کا "ریاست" اس اعتبار سے اہم تھا۔ مفتون نے دیسی مہاراجوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کی، ان کی عیاشیوں کے پردہ چاک کئے۔ ان پر مقدمات ہوئے اور تحریک آزادی کے سلسلہ میں جیل میں نظربند رہے۔ یہ وہی دیوان سنگھ مفتون ہیں جنہوں نے ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ کے "ہمدم" میں بلا تنخواہ صحافت سیکھنے کی غرض سے کام کیا اور ۱۹۱۹ء میں خواجہ حسن نظامی کے ساتھ مل کر دہلی سے روزنامہ "رعیت" جاری کیا تھا۔ آیئے دیکھیں کہ اس دور کے وہ کون سے اہم صحافی ہیں جنہوں نے اردو کے بدلتے ہوئے اسالیب پر اپنی تحریر کے نقش چھوڑے ہیں۔

مولانا سلیمان ندوی اور معارف

علامہ شبلی کے قائم کردہ ممتاز ادارے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ۱۹۱۶ء میں "معارف" کا اجرا ہوا۔ اس کے مدیر مولانا سلیمان ندوی تھے اور آزادی ہند تک برابر ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران اس جریدہ نے ملک و معاشرہ اور زبان و ادب کی مہتم بالشان خدمات انجام دیں۔ اس نے نہ صرف علمی موضوعات اور اسلامیات کی مختلف شاخوں میں گرانقدر تحریریں پیش کی بلکہ ملک و بیرون ملک کے بے شمار سیاسی عمرانی، ثقافتی ار وادبی ولسانی موضوعات پر تازہ تازہ خیالات تاثرات اور تبصرے شائع کئے۔ مولانا سلیمان ندوی کا قلم بیک وقت ایک عالم، ایک محقق، ایک انشاپرداز اور ایک صحافی کا قلم تھا جو عصری مسائل واحوال سے پوری طرح باخبر و بیدار تھا۔ وہ گرد و پیش کے واقعات میں عبرت و نصیحت کے بے شمار پہلو تلاش کر لیتے تھے۔ بقول ضیاءالدین اصلاحی

> "انکے شذرات صرف وقتی و عارضی حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی معنویت و تازگی آج بھی بر قرار ہے اور ان سے ہر زمانہ میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔"(۱)

ضیاءالدین صاحب کی یہ رائے حق بجانب ہے کہ ان شذرات نے اپنے اعتدال و توازن کی بنا پر قدیم و جدید دونوں طبقوں کو متاثر کیا۔ انشاءو تحریر کے نئے طریقوں سے آشنا کیا۔ ماضی کے علوم اور فکری سرمایہ پر اعتماد بحال کرایا۔ مولانا سلیمان ندوی کی صحیفہ نگاری اور شذرات نویسی کا یہ پہلو بھی بے حد دلکش ہے کہ زبان واسلوب کے اعتبار سے بھی ان پر دلکشی رعنائی اور انفرادیت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ خشک و بے مزہ عبارت آرائی کے قائل

---

(۱) شذرات سلیمانی حصہ اول۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، مقدمہ ۷

نہیں۔ دبستان شبلی کا رنگ ان پر کیوں نہ غالب ہو کہ وہ خود علامہ کے ممتاز ترین جانشین تھے اور ان کے ادھورے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا انہوں نے شرف حاصل کیا۔ بقول مولانا عبد الماجد دریابادی :

> "صاحب معارف کی شذرات نگاری ایک خصوصی اور امتیازی شان نگارش رکھتی ہے۔ بے لاگ لیکن نہ درشت نہ کرخت، عمیق لیکن نہ ادق نہ مغلق، رنگین لیکن نہ پر تکلف نہ ثقیل، سلیس لیکن نہ سطحی نہ عامیانہ، شگفتہ لیکن نہ ناولانہ نہ خطیبانہ، جاندار لیکن نہ گرماگرم نہ پر خروش، صالح لیکن نہ خشک نہ مولویانہ، سلیمانی ادب و انشا کا اردو کی تاریخ ادب و انشا میں جو ایک خاص مقام ہے اسکی اصل بنیاد ہی معارف کے ادارتی صفحات سے پڑی اور معارف کے شذرات نے بہتوں کے لئے ایک نئی راہ کھول دی۔"(۱)

مولانا سلیمان کے شذرات دیکھئے تو الفاظ نہیں پوری بلاغت اور جملے اپنی پوری معنویت و سحر کاری کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ وہ جذبات سے زیادہ ہمارے ہوش و خرد کو اپیل کرتے ہیں۔ وہ ہنگامہ سے زیادہ خاموش متین اور پرسکون تعمیری جدوجہد کے قائل ہیں۔ خلافت تحریک کے زمانہ میں ہندوستان میں جذبات کا ابال آیا ہوا تھا۔ لیڈروں کا استقبال فلک شگاف نعروں کے ساتھ کیا جاتا اور آسمان کی چھت اڑا دینے والی تقریریں کی جاتی تھیں۔ مولانا سلیمان ندوی رقمطراز ہیں :

> "ہم سے کہا جاتا ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس وقت تڑپتی ہوئی لاشوں، کٹی ہوئی رگوں اور بہتے ہوئے خون کی ضرورت ہے۔ ہم سر تاپا اثر جھک کر دیکھنے لگتے

---

(۱) بحوالہ شذرات سلیمانی، مقدمہ ص ۷

ہیں کہ خوشی یہاں مقرر کے سینے میں تڑپتی لاش ہے گردن میں گئی ہوئی رگ ہے،
بدن میں کہیں بہتا ہوا خون ہے لیکن تامل کے بعد نظر آتا ہے کہ یہ صرف رونق بازار
اور گرمی ہنگامہ کا سامان تھا۔ نہ کہیں لاشیں تڑپیں، نہ رگیں کٹیں، نہ کہیں خون بہا ہے
.........اُمّ الاحرار کے جلوس میں اللہ اکبر کے زلزلہ انداز نعرے دم بدم سنائی دیتے
تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کا کنگرہ اب زمین پر آیا یا زمین کا طبقہ اب نیچے کو دھنس
جانا چاہتا ہے۔ لیکن جب بھیڑ چھٹ جاتی تو آسمان اپنے مدار پر اور زمین اپنے نقطہ پر
نظر آتی تھی...... ہم نے کہا اور پھر کہتے ہیں کہ مسلمان دم میں جل جانے والے اور جلا
دینے والے کوہ آتش فشاں ہیں لیکن ہمیشہ سلگنے والے اور جلتے رہنے والے آتشکدہ
نہیں۔ وہ ایک لمحہ کے لئے آنے والے اور گزر جانے والے طوفان آب ہیں لیکن
ہمیشہ بہنے والے ہمالیہ کی برفستانی چوٹیوں کے چشمے نہیں۔ ہم جوش بیان آزادی قول
اور نعرۂ حق کے ساتھ ایک اور چیز بھی ڈھونڈھتے ہیں متانت رائے، استقلال عزم
اور دوام عمل۔ دنیا کی تاریخ قول سے نہیں عمل سے بنی ہے۔ اسلئے ہمارے نزدیک
کمزور عمل پرزور بیان سے بہتر اور تھوڑا کرنا بہت بولنے سے اچھا ہے۔" (۱)

پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمنی نے زہریلی گیسوں کا استعمال کیا تھا اور دنیا اس بربریت پر تھرا اٹھی تھی
مگر مولانا سلیمان ندوی اس خبر پر کہ اب امریکہ نے بھی ہدایت دی ہے کہ اس کا ہر فوجی اپنی اپنی جیب میں ایک
منجمد زہریلی گیس کی ڈبیہ لازماً رکھے گا یہ تبصرہ کرتے ہیں :

---

(۱) شذرات سلیمانی، ص ۴۶

"مسئلہ کے سیاسی پہلو سے یہاں واسطہ نہیں۔ یہاں دکھانا صرف یہ مقصود ہے
کہ یہ اس قوم کا طرز عمل ہے جو مغرب میں صلح و آشتی کی سب سے بڑی علمبردار
مشہور ہے۔ جس کے آئین اساسی میں یہ دفع بھی شامل ہے کہ اس قوم کو دوسروں
کے لڑائی جھگڑے سے کوئی واسطہ نہ ہوگا اور جس کے رئیس حکومت کو ایک لاکھ کا
گرانقدر نوبل پرائز اس بنا پر عطا ہوا ہے کہ انہوں نے قیام امن کی بہترین مساعی سے
کام لیا۔ دنیا کشت و خون کے مناظر سے اکتا گئی ہے اور اس سے بچنے کا ہر ممکن ذریعہ
سے وسیلہ تلاش کر رہی ہے لیکن کیا اس سعی میں کامیابی کی بھی صورتیں کہ اقوام
اپنے تئیں جنگی شقاوت اور حربی سنگدلی کے لئے روز بروز تباہی کرتی رہیں۔ یہ
صورت حال لازمی نتیجہ ہے اس نظام تمدن کا جس کی سیادت کا شرف یورپ و امریکہ
کو حاصل ہے۔ جس ضابطہ اخلاق میں انکسار و فروتنی، غیرت و قناعت کا کوئی درجہ نہ
ہو، جس طرز معاشرت میں بلند ترین مرتبہ، عالی حوصلگی کو دیا گیا ہو جس فلسفہ
سیاست میں فن احتیال و حکمت عملی کو فضائل و کمالات میں شمار کیا جاتا ہو اور جس
نظام تمدن کی بنیاد تمام تر متنازعہ للبقا مسابقت و باہمی کشمکش پر ہو اس کے علمبرداروں
سے یہ توقع رکھنا کہ ان کی کوششیں مستقل و پائیدار امن و امان کو وجود میں لا سکیں گی
گرگ سے گلہ بانی کی امید قائم کرنا ہے۔" (۱)

مولانا سلیمان ندوی کی عبارت میں ایک خطیب و انشاء پرداز کی روانی و حسن بیان ہے۔ اس کا اتار چڑھاؤ اور

(۱) شذرات سلیمانی۔ سلیمان ندوی۔ از ماہنامہ معارف ۱۹۲۱ء اعظم گڑھ ص ۸۴

نفس موضوع کے مختلف گوشوں کی وضاحت اور اس حاصل شدہ نتائج کے ابلاغ و ترسیل پر ان کی استادانہ قدرت ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ مولانا کی نگاہ بین الاقوامی اور عالمگیر وسعت رکھتی ہے۔ وہ ایک حکیم فرزانہ کی طرح واقعات سے کام کی باتیں نچوڑ لینے اور پھر اسے قارئین کے لئے درس عبرت و موعظت بنا دینے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس وصف خاص میں ان کو مولانا عبدالماجد کا ہم رتبہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مولانا کے شذرات میں طنز کی چٹکی، مزاح کی نمکینی اور ظرافت کی شادابی بھی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ لکھنؤ لارڈ بشپ کے نوروز کے موقع پر دعا کا ایک قصہ نقل کرنے کے بعد جس میں موصوف نے خدا سے التجا کی تھی کہ ہمارے دلوں سے رشک و حسد کو دور کر اور ہمارے غرور کو توڑ اور ان تمام نسبی تعصّبات کو دور کر دے جو مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے درمیان اخوت و محبت کی راہ میں حائل ہیں۔ اس دعا میں انگریز گورنر اور حکام اعلیٰ شریک تھے۔ مولانا کا تبصرہ ملاحظہ ہو :

> ”اخبارات میں ہے کہ اس دعا پر حاضرین نے آمین کہی۔ لیکن معلوم نہیں کہ عہدہ داران سیاسی بھی آمین کہنے والوں میں تھے یا نہ تھے اور اگر تھے تو یہ امر بھی تحقیق طلب رہ جاتا ہے کہ ان کے قلوب ان کی زبانوں کے کس حد تک شریک تھے۔ سیاسی حکام سے قطع نظر امید ہے کہ لارڈ بشپ صاحب نے اس پر غور کر لیا ہو کہ آج جس صورت حال کو مٹانے کے لئے انہوں نے دعا مانگنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اس کے پیدا کرنے کی ذمہ داری خود ان کی جماعت پر کس قدر عائد ہوتی ہے۔ جنگی جہازات پر ہر سال کروڑوں روپئے صرف کرنا، مے نوشی، بد چلنی اور دوسری نفس پرستیوں پر بے شمار دولت خرچ کرنا کمزور قوموں سے غلامی کا کام لینا سیاسی مصالح

کے لئے حق و صداقت کو بالکل پس پشت ڈال دینا، قتل و خونریزی میں مشغول رہنا ان میں سے کوئی شے ایسی ہے جسے حضرت مسیحؑ کی تعلیم سے کچھ بھی علاقہ ہے۔"(۱)

مولانا سلیمان ندوی نے صحافت اور شذرہ نگاری کو پیغمبرانہ رفعت عطا کی۔ وہ قوموں کے عروج و زوال اور خوش حال و بربادی کے فلسفہ پر بڑی حکیمانہ زبان میں تبصرہ کرتے ہیں۔ وہ آفات ارض و سماوی سے بھی درس عبرت لینے کا مشورہ دیتے ہیں اور اس کائنات کے ہر ہر حادثہ میں موعظت کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ اشتراکی روس میں ۱۹۲۱ء میں زبردست قحط پڑا اور اپنی ساری روشن خیالی، خدا بیزاری اور ترقی پسندی کے باوجود وہ خود اپنے شہریوں کی بربادی و تباہی کو روک نہ سکا۔ اس حادثہ سے مولانا سلیمان ندوی کس سادہ سلیس اور رواں پیرایہ میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں :

"تمدن جدید نے آخرت و عاقبت کے خیال کو علانیہ ایک اہم ضعف عقیدگی قرار دیا ہے اور اپنا تعلق تمام تر دنیوی ترقی و مادی زندگی سے رکھا ہے لیکن حیات مادی میں بھی جب اس کی بہترین مساعی کا نتیجہ ہلاکت و بربادی کی صورت میں نکل رہا ہے اور تمام تدابیر تحفظ پیہم ناکام ثابت ہو رہی ہیں تو خدارا بتایا جائے کہ ان تجربات و مشاہدات کے ہوتے ہوئے اس بت کو پوجتے رہنا اور اسی چبائی ہوئی ہڈی کو چبائے جانا کون سی دانشمندی و خوش فہمی ہے......" (۲)

غرض سید سلیمان ندوی معارف کے صفحات کے ذریعہ ایک ایسی نثر کو فروغ دیتے ہیں جو کاروباری نثر ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی و علمی چاشنی اور حکیمانہ و عارفانہ لطافت بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہ وہ عہد تھا جب کہ

---

(۱) معارف ماہ فروری ۱۹۲۱ء اعظم گڑھ

(۲) معارف ماہ فروری ۱۹۲۱ء اعظم گڑھ

اردو صحافت کوچہ تجارت سے زیادہ کوچہ علم وادب کی رونق تھی اور اس وقت کے شذرہ نگار اپنے عہد کے ممتاز مفکر، معلم، انشاء پرداز اور ادیب تھے۔

منشی دیانرائن نگم مدیر زمانہ و آزاد

کانپور سے منشی دیانرائن نگم رسالہ زمانہ کی ادارت سے منسلک ہوئے اور اپنی وفات یعنی ۱۹۴۲ء تک اسے آب و تاب کے ساتھ شائع کرتے رہے۔ نصف صدی تک اس جریدہ نے اردو ادب اور صحافت کی شاندار خدمات انجام دیں۔ اسی عہد کے ممتاز اہل قلم اس رسالہ میں لکھنا باعث عز و شرف تصور کرتے رہے۔ اس کے قلمی معاونین میں سوامی رام تیرتھ، مولانا نذیر احمد، مولانا ذکاءاللہ، نواب محسن الملک، حالی، شبلی، عبدالحلیم شرر، اکبر الہ آبادی، درگا سہائے سرور، نوبت رائے نظر، بشن نرائن در، محمد اقبال، خواجہ حسن نظامی، پریم چند، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، یگانہ چنگیزی، شاد عظیم آبادی، ریاض خیر آبادی، چکبست، موہن لال رواں، نیاز، جگر، جوش، فراق، اثر لکھنوی، آنند نرائن ملا، حفیظ جالندھری وغیرہ شامل تھے۔ اردو زبان وادب پر منشی کے احسانات کا ہر ممتاز صاحب قلم نے اعتراف کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو زبان کو گاندھی کے تصور کے مطابق آسان اور عام فہم بنائے رکھنا چاہئے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''اس زبان میں ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ ہم اس کی یہ سب سے بڑی خصوصیت قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس زبان کو عربی فارسی اور سنسکرت کے ثقیل و غیر مانوس الفاظ سے گراں بار نہ کرنا چاہئے۔'' (۱)

وہ سائنٹفک اور اصطلاحی الفاظ کے ترجموں میں غیر مانوس عربی و فارسی الفاظ کے استعمال کے خلاف تھے اور انگریزی اصطلاحات کے استعمال میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ (۲)

---

(۱) ''زمانہ'' اپریل ۱۹۲۵ء (۲) زمانہ دسمبر ۱۹۲۵ء

منشی دیانرائن نگم نے ۱۹۱۲ء سے کانپور سے ہفتہ وار اخبار آزاد بھی شائع کرنا شروع کیا اور یہ ہفت روزہ ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ ان دونوں پرچوں میں صحافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا گیا۔ منشی جی پریس کی آزادی کے زبردست حامی تھے۔

"ہمارا سب سے اہم اور پرزور مطالبہ پریس کی مکمل اور قطعی آزادی ہے"(۱)

منشی جی اخبار نویسی کو ایک مقدس اور عظیم القدر پیشہ تصور کرتے تھے جس سے ضمیر کی خوشنودی اور قلب کا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے جب زمانہ کی ادارت قبول کی تو ان کے سامنے یہ مقاصد اور یہ مشن موجود تھا۔

"بعد صلاح و مشورہ کے یہ طے پایا کہ زمانہ محض شاعری و انشاپردازی کے ہاتھ گروی نہ ہو جائے۔ زمانہ میں وسیع ترقی زبان کا خیال لئے ہوئے اصلاح خیالات، درستی مذاق، توسیع معلومات ترقی اتحاد وغیرہ کا زیادہ خصوصیت کے ساتھ التزام کیا جائے"(۲)

بقول شیخ عبد القادر مدیر مخزن منشی دیانرائن اس اصول پر آخر تک کاربند رہے۔ بقول جوش ملیح آبادی:

کبھی مفکر کی روشنی میں فلک کو کھولا زمیں کو پلٹا
کبھی صحافت کے آئینے میں عرب کو پرکھا عجم کو دیکھا

جناب ثاقب کانپوری نے اردو صحافت میں ان کی اہمیت و عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اردو کی ادبی صحافت کا تصور منشی دیانرائن نگم کے بغیر اسی طرح ممکن ہی

---

(۱) زمانہ اپریل ۱۹۳۷ء (۲) ماہنامہ زمانہ کانپور، جنوری ۱۹۰۴ء

نہیں جس طرح مسلمانوں کی تعلیم کا سر سید کے بغیر اور اردو کے تحفظ کا کوئی تصور منشی دیانرائن نگم کو علیحدہ کر کے نہیں کیا جاسکتا"(۱)

ضیاءالدین اصلاحی صاحب ان کے صحافتی وادبی معیار پر گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

'وہ اردو کو سہل و سلیس اور عام فہم بنانے پر اپنے مضامین اور اداریوں میں بڑا زور دیتے تھے۔ وہ اردو کو اردو کے بجائے ہندوستانی کہتے تھے اور اردو ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیتے تھے۔"(۲)

ناظر کاکوروی لکھتے ہیں:

"آپ کی زبان میں سلاست اور لوچ موجود ہے۔ بسا اوقات آپ کی نثر میں شاعری ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کو سلیس اور صحیح اردو پڑھنے کا شوق ہو تو اس کو زمانہ کے پرانے فائل ضرور دیکھنا چاہئے۔"(۳)

منشی دیانرائن نگم کے سادہ سلیس اور رواں طرز تحریر کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

"ہندوستان کی اصل آبادی دیہاتوں میں سیدھی سادی زندگی بسر کر رہی ہے۔ تعلیم سے وہ بے بہرہ ہے۔ پیٹ بھر روٹی اسے کھانے کو ملتی نہیں۔ ملکی ترقی کا اسے کیا حوصلہ ہو سکتا ہے۔"

ترک موالات اور ترک تعلیم کی تحریک پر وہ لکھتے ہیں:

"ترک تعلیم کے مشورے کا ایسا مضر اثر ہوا کہ صدہا خام کار ونا تجربہ کار نوجوان

---

(۱) نقوش لاہور، شخصیات نمبر حصہ دوم۔ (۲) نیا دور لکھنؤ جون جولائی ۱۹۸۲ء، ص ۴۹۔ (۳) اردو کے ہندو ادیب، ناظر کاکوروی ص ۷۰۔

نے نان کو آپریشن کی حمایت بطور پیشہ اختیار کرلی۔ کھدر سے وہی فائدہ اٹھایا گیا جو ملک کے پیشہ ور سادھوا پنے جوگیانے لباس سے روزمرہ اٹھاتے رہتے ہیں"(۱)

ہندی اور اردو کی کشمکشن کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"میری رائے میں ہندی اردو زبانوں میں باہمی کشمکش عبث ہے۔ اردو ہندی کے حامیوں میں رقیبانہ جنگ و جدل نہ صرف بیکار بلکہ دونوں زبانوں کی ترقی میں سنگ راہ ہے۔ ہم کو ان کوششوں کے باقاعدہ تدارک کی ضرورت ہے جو دونوں زبانوں میں تفریق پیدا کررہی ہیں۔"(۲)

غرض رسالہ زمانہ کانپور اور اخبار آزاد کانپور نے نصف صدی تک اردو صحافت کے گیسو کو سنوارا ہے اور اس عام فہم سلیس ورواں اردو کو ہماری صحافت کی مقبول زبان بنانے کی کوشش کی جسے گاندھی جی نے ہندوستانی کے نام سے یاد کیا تھا۔

---

(۱)زمانہ کانپور، دسمبر ۱۹۲۵ء (۲) مجلّہ نیادور، دیانرائن نگم نمبر جولائی ۱۹۸۲ء ص ۱۴۲۔

مستقل

مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۲۸ء سے کانپور سے روزنامہ مستقل جاری کیا۔ یہ اخبار کچھ دنوں ہفت روزہ رہا، پھر کچھ دن دو روزہ ہو کر شائع ہوتا رہا، پھر سہ روزہ ہو گیا۔ ۳۱-۱۹۳۰ء میں یہ ہفت روزہ اور پھر ۱۹۳۲ء میں ماہنامہ ہو گیا۔ مولانا کی مصروفیات اور مالی دقتیں اس اخبار کی تغیر کی موجب ہوئیں لیکن ان کی نثر کے تیور میں فرق نہیں۔ وہی گرجدار اور بے باکانہ آواز ان کی نثر سے سنائی دیتی رہی جس سے استعماریت کے ایوانوں میں زلزلہ آتا رہا۔ اس اخبار پر شعر و ادب کی چھاپ نہ تھی اور اس کا رنگ خالصتاً سیاسی تھا۔ مگر سیاسی مباحث میں بھی مولانا کی نثر کا بانکپن برقرار ہے۔

مستقل کے شذرات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حسرت ایک منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ وہ جگہ محاوروں اور چھبے ہوئے اشعار کی مدد سے اپنا مافی ضمیر واضح واضح کرتے ہیں۔ ان کی عبارت میں بعض جملے کڑی کمان کے تیر کی طرح اپنے ہدف کو نشانہ بناتے ہیں۔ مولانا حسرت آزادی کامل کے زبردست علمبردار تھے۔ جب ان کے مطالبہ آزادی کامل کو کانگریس نے منظور نہ کیا تو انھوں نے دیگر اور اختلافات کی وجہ سے کانگریس کو خیر باد کہہ دیا اور اس کی بزدلانہ پالیسی پر کھل کر تنقید کرنے لگے۔ ۱۲ اگست ۱۹۲۹ء کے مستقبل میں "آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا فیصلہ" کے عنوان سے کانگریس پر سخت تنقید کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

> "مہاتما جی کے آخری فقرے نے کانگریس کی سیاست کا بھانڈا پھوڑ ڈالا اور ایک انگریزی ضرب المثل کے مطابق بلی بیگ کے اندر سے نکل پڑی اور صاف ظاہر ہو گیا کہ گاندھی، بوس، نہرو، گھوش گپتا مہتا اور اسی قسم کے جملہ غلامی پسند اور پست ہمت اور تنگ خیال افراد کی یہ ساری شوں شاں اور فوں فاں محض بیکار ہے جس کو

گیدڑ بھبکی کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کرتے"(۱)

اس شذرے سے مولانا کا لب و لہجہ استدلالی اور سنجیدہ کم اور جذبات سے لبریز زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس وقت جنگ آزادی میں اس طرح کے تیور کے بغیر شاید بات سننے پر لوگ آمادہ بھی نہ ہوتے لیکن مولانا کا انداز استدلال اور متانت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ آزادی کامل کی تجویز ان کے دل کے اندر ایک دہکتا ہوا انگارہ تھا اور جنگ آزادی میں شامل جماعت کانگریس اس پر مسلسل پانی ڈال رہی تھی۔ وہ ممتاز رہنماؤں کی ٹال مٹول کو دیکھ کر حیران تھے۔ وہ نہایت سلیس رواں اور عام فہم نثر میں اپنی بات سمجھانے کی بار بار کوشش کر رہے تھے۔ 'مستقل' کے ایک شذرے میں 'فریب انکسار' کے عنوان سے گاندھی جی کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"کلکتہ کانگریس کے موقع پر جب آپ نے دیکھا کہ آزادی کا ریزولیوشن پاس ہی ہوا جاتا ہے تو فوراً یہ تجویز پاس کرادی کہ ایک سال کے لئے تو نہرو رپورٹ اور اس مجوزہ حکومت بطرز نو آبادیات کو قبول کر لینا چاہئے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک کوشش کر کے دیکھنا چاہئے کہ حکومت برطانیہ رپورٹ کو منظور کرتی ہے یا نہیں اگر کر لے تو فبہا ورنہ یکم جنوری ۱۹۳۰ء سے آزادی کامل کی حمایت کی جائے"

پھر یہ تبصرہ ملاحظہ ہو

"مہاتما جی کا ہمیشہ سے یہی معمول رہا ہے کہ اگر جمہور کی کسی محبوب تجویز سے اختلاف کرنے میں انھیں سیاسی بدنامی کا اندیشہ ہوتا ہے تو حتی الامکان وہ بندوق کو دوسروں کے کاندھے سے سر کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جس طرح ۱۹۲۱ء کی احمد آباد کانگریس اور خلافت کانفرنس میں رقم حروف اور مولانا آزاد سبحانی کی تجویز آزادی

---

(۱) مولانا حسرت موہانی اور تحریک آزادی، مرتب محمد طیب دہلی ۱۹۹۶ء ص ۱۴۸۔

کامل کا خون آپ نے مرحوم حکیم اجمل خاں کے ہاتھوں سے کرایا'۔(۱)

ایک اور شذرہ میں وہ مسٹر پٹیل کی خبر لیتے ہیں جن سے وائسرائے کی محفل تسلی پر آزادی کامل کے سلسلہ میں موقف تبدیل کرنے کا اندیشہ حسرت موہانی کو تھا۔ حسرت اپنے تبصروں کے درمیان فارسی کے چبھتے ہوئے مصرعوں کو نگینہ کی طرح فٹ کر دیتے ہیں جس سے عبارت کی شدت تاثیر میں اجافہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی مولانا جذابت کی رو میں بہہ کر اپنے حریفوں کے بارے میں نہایت سخت ریمارک دینے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ وہ ملمع وپالش کے قائل نہیں۔ بہت زیادہ نرم ونازک اور گول مول انداز اختیار کرنے کی ان کو عادت نہیں۔ ''چودم برداشتہ مادہ بر آمگر' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''لاہور کانگریس کے صدر منتخب ہندوستان کے مشہور حریت نواز نوجوان لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی آخر کار کچھ تو اپنی فطری اور آبائی اعتدال پسندی کی بنا پر کچھ مہاتما گنادھی کی عیارانہ پند ونصیحت سے مسحور ہو کر لارڈ ارون کے تحفہ غلامی کو ہدیہ حریت قرار دے بدل و جان منظور کر لیا۔ ہم کو نہ جواہر لال کے طرز عمل سے شکوہ ہے نہ مہاتما کے فریب کار سے شکایت، رونا صرف اس بات کا ہے کہ اس کے بعد بھی بہت سے لوگ جن میں کچھ بے وقوف مسلمان بھی شریک ہوں گے مہاتما کو نیک نیتی اور سچائی کا دیوتا اور جواہر لال کو حریت کامل کا دلدادہ کہتے بلکہ سمجھتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ''(۲)

---

(۱)و(۲) مولانا حسرت موہانی اور تحریک آزادی، مرتبہ محمد طیب ص ۱۵۰، ۱۵۲، اخبار مستقبل ۲۶ اگست ۱۹۲۹ء۔

مدینہ بجنور

بیسویں صدی کے ربع ثانی میں مدینہ بجنور نے آزادی کی جدو جہد اور کانگریس و خلافت کی سرگرمیوں کی پرجوش ترجمانی اپنے صفحات پر کی۔ ۱۹۲۸ء میں ملک نصر اللہ عزیز اس کے مدیر مقرر ہوئے اور مدینہ کو صحافتی اعتبار سے صف اول کے اخباروں میں لا کھڑا کیا۔ گاندھی کی نمک سازی کی مہم اور ڈانڈی مارچ کا ۱۹۳۰ء میں اس اخبار نے بھرپور ساتھ دیا اور جرأتمندانہ تبصرے کئے۔ اس کے نتیجہ میں نصر اللہ خاں عزیز گرفتار ہوئے اور ایک سال سزائے قید سنائی گئی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور الجمعیۃ

جمعیۃ العلماء ہند نے ۱۹۲۵ء میں الجمعیۃ اخبار جاری کی تو اس کی ادارت کے لئے اس کی نگاہ انتخاب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر پڑی جو اس سے قبل تاج جبلپور کے مدیر تھے اور معارف نگار اور مخزن جیسے جرائد میں قلمی تعاون کر رہے تھے۔ الجمعیۃ سے وہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء سے وابستہ رہے۔ ان کے بعد مولانا محمد عثمان فارقلیط کا عہد ادارت شروع ہوا۔ مولانا مودودی نے حیدر آباد سے ۱۹۳۳ء سے ماہنامہ ترجمان القرآن کی ادارت سنبھالی۔ ان کی صحیفہ نگاری اس عہد کے ممتاز صحافیوں اور نثر نگاروں کی طرح حکیمانہ اور عارفانہ رنگ و آہنگ کی حامل ہے۔ مولانا مودودی نے شائستہ علمی تنقید کی روایت قائم کی اور صاف ستھری، رواں اور خوبصورت نثر کے ذریعہ گونا گوں مسائل اور پیچیدہ موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ محاورہ اور روزمرہ پر ان کو مکمل قدرت ہے۔ عربی و فارسی و اردو کے کلاسیکی ادب سے وہ گہری واقفیت رکھتے ہیں اور انگریزی زبان و ادب کے اسالیت سے پوری طرح روشناس ہین۔ انھوں نے خلافت تحریک کی ناکامی کے بعد جو افسردگی اور مایوسی کی کیفیت پوری قوم پر طاری تھی اسے اپنی اثر انگیز تحریروں سے ختم کیا۔ وہ حقائق کو افسانہ بنانے کے بجائے اسے جیوں کا تیوں پیش کرتے ہیں لیکن اسلوب کا حسن اسے سحر انگیز بنا دیتا ہے۔ بقول پروفیسر خورشید احمد

> "انھوں نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ ان کی زبان پر دوسرے اثرات نہ پڑیں۔ ان کی نثر میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جن سے اردو نثر کا بنیادی اسلوب عبارت ہے۔(۱)

ان کی صحیفہ نگاری کے اولیں دور میں ابوالکلام و شبلی کے اثرات ان پر محسوس ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء تک

---

(۱) ادبیات مودودی، مرتبہ خورشید احمد، مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۹۸۰ء ص ۱۶۔

آتے آتے ان کا مخصوص انداز و اسلوب نکھر کر سامنے آ گیا۔ وہ زندگی کے ہزاروں مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں لیکن بے ساختگی اور شگفتہ پن میں کمی نہیں واقع ہوتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا مودودی کا اسلوب سر سید کے اسلوب کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ سر سید سے اردو کی صحافتی نثر کس قدر متاثر ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

> ''علم کلام کے موضوعات کو اردو میں ادا کرنے کا ڈھنگ شبلی نے سر سید سے سیکھا اور اس سلیقہ خاص کو سلیمان ندوی تک شبلی نے منتقل کیا۔ مولانا آزاد کی انفرادیت عربیت بلند آہنگی اور دشوار پسندی کی دیواریں بہت بلند سہی لیکن سر سید کے اثر سے اس دیوار میں بھی روزن نظر آتے ہیں۔ سر سید نے اسلام پر جس انداز سے قلم اٹھایا اسے محسن الملک، حالی، شبلی، سلیمان ندوی اور مولانا مودودی کے اسالیب کی شیرازہ بندی کی ہے۔''(۱)

مولانا مودودی کی صحافیانہ تحریروں اور علمی مضامین میں خطابیہ انداز پایا جاتا ہے مگر اس میں توازن موجود ہے اور اپنی برتری کی جھلک نہیں نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں وضاحت اور استدلالی قوت پائی جاتی ہے۔ اپنی بات واضح کرنے کے لئے وہ منطقی ترتیب اور مثالوں سے کام لیتے ہیں۔ وہ الفاظ کے انتخاب پر بھی حسن ذوق سے کام لیتے ہیں۔ اجنبی الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں متانت اور سنجیدگی بھی ہے اور جذبہ، حسن و رعنائی بھی۔ وہ بقول ابوالخیر کشفی دھیمے اور معصوم الفاظ میں طنز کی روح پھونک دیتے ہیں۔ سر سید کی طرح مولانا مودودی بھی اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ کبھی کبھی اور مترادفات کا استعمال بہ کثرت کرتے ہیں اور کبھی کبھی یہ بار خاطر محسوس ہوتے ہیں۔

---

(۱) ادبیات مودودی، مرتبہ خورشید احمد، مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۹۸۰ء ص ۱۶۔

۱۹۲۸ء میں جب مولانا مودودی حیدر آباد تشریف لے گئے تو ان کی جگہ ہلال احمد زبیری نے لی اور ان کے معاون محمد عثمان فارقلیط منتخب ہوئے۔ محمد عثمان فارقلیط نے اسے نقطہ عروج تک پہونچادیا۔ جنگ آزادی میں جمعیۃ العلماء سرگرم رول ادا کر رہی تھی چنانچہ اس کا ترجمان الجمعیۃ بھی آزادی کی جنگ کے ہراول دستہ میں شامل تھا اور اپنی پر جوش تحریروں سے حریت کا ولولہ دلوں میں پیدا کر رہا تھا اور غیر ملکی سامراج کی ستم رانیوں کو صبر و تحمل سے برداشت کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔ انگریزی حکومت نے بالآخر اس اخبار کو بند کرادیا اور دوبارہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ آزادی سے پہلے اس اخبار کی خدمات خاص طور پر اسلوب نگارش کے نقطہ نظر سے جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آسان اور سلیس زبان کو فوقیت دی لیکن کہیں کہیں جوش خطابت عود کر آتی ہے۔

سچ و صدق

مولانا عبد الماجد دریابادی نے بیسویں صدی کے ربع ثانی میں اپنے اخبارات سچ و صدق میں اردو صحافت کو ایک انوکھا اسلوب عطا کیا۔ ہفتہ وار سچ بند ہونے کے بعد مولانا نے صدق کے عنوان سے ۱۹۳۵ء میں ہفت روزہ جاری کیا جو آزادی ہند تک جاری رہا۔ مولانا ان اخباروں میں عصری مسائل پر بے لاگ تبصرے فرماتے ہیں ان کی مخصوص طرز نثر نگاری کے مطابق ان کی تحریروں کا ہیولیٰ مختصر مگر نہایت رواں نوکیلے اور زود اثر جملوں سے تیار ہوتا ہے۔ وہ بلا خوف لومۃ لائم اپنی بات کہہ گذرتے ہیں اور کوئی موقع حکمت و موعظت کا ضائع نہیں کرتے۔ وہ قرآن حکیم اور احادیث اور حکماء کے اقوال و اقتباسات کے حوالوں سے اپنی عبارت کو با مقصد اور اعلیٰ نصب العین کی حامل بنا دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک صحافت فرد و معاشرہ کی اصلاح کا ایک بہت بڑا حربہ ہے۔

''ہمارے روزناموں کے لئے'' کے عنوان سے صدق میں ایک معاصر کی توصیف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اصلاح کا کتنا بڑا حربہ ہر روزنامہ کے ہاتھ میں ہے۔ عام ناظرین اخبار جب دیکھتے ہیں، کہ ہر چھوٹے چھوٹے اور مقامی و سیاسی جزئیہ پر اخبار ضرور لکھتا ہے اور ہر گہرے ایمانی اور اخلاقی فتنوں پر کچھ نہیں لکھتا تو ان کے دلوں سے قدرتاً ان برائیوں کی اہمیت بھی مٹتی جاتی ہے''(۱)

اسی طرح ایک مسلم قوم پرور جریدہ کی سرزنش اس کے ایک ایڈیٹوریل کے حوالجہ سے کرتے ہیں عنوان ہے ''رام راج کو بدنام کرنے والے'' اس تبصرہ میں ان لوگوں کی بھی خبر لی گئی ہے جو اپنے طرز عمل سے خود رام راج کو بدنام کر رہے ہیں:

---

(۱) صدق لکھنؤ، ۱۷ مارچ ۱۹۴۷ء

"ہم نہ سامراج کو براشت کر سکتے ہیں نہ ٹام راج کو نہ رام راج کو۔ یہ سامراج
اور ٹام راج تو خیر لیکن یہ رام راج سے آخر اتنی بیزاری کیوں۔ رام راج کی جو تصویر
تلسی داس نے رامائن میں کی ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور عدل و
مساوات و فراغت کے لحاظ سے عام و خاص کے لئے تاریخ کا بہترین دور تھا۔ یہ رام
راج کو محل مدح سے محل ذم پر پہونچانے کی اور ظلم و اندھیرے کے مرادف بنادینے
کی ذمہ داری آخر کس فریق کس قوم اور کس فرقہ پر ہے۔ بہار کے اور گڈھ مکتیشر
کے اور کلکتہ کے واقعات سے پہلے رام راج کے یہ معنی کسی قوم پرور مسلمان کی
فرہنگ لغت میں تھے۔"(۱)

مولانا عبدالماجد کو ہر طرح کے خیالات کے اظہار پر غیر معمولی قدرت ہے اور خاص بات یہ ہے کہ طنز کے نشتر بڑی خوبصورتی سے ان کی عبارت میں پنہاں ہوتے ہیں اور قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ اگر وہ ایک طرف لیگ کو ٹوکتے ہیں تو دوسری طرف کانگریس کے قوم پرستوں کو ان کی بے اعتدالیوں پر ٹوکتے ہیں۔ اس معاملہ میں اپنی محبوب شخصیتوں کو بھی نہیں بخشتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک واقعہ پر "بت شکن کی بتگری" کے عنوان سے ٹوکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۳مارچ ۱۹۴۷ء کو مرکزی اسمبلی میں مولانا کا یہ بیان سامنے آتا ہے کہ حکومت ایک کروڑ روپیہ کا خطیر سرمایہ ڈرامہ رقص، موسیقی کی اکیڈمی کے قیام پر نیز فنون لطیفہ اور عجائب کانہ کے لئے صرف کرے گی۔ اتفاق سے عین اسی زمانہ میں جبکہ مولانا ماجد صاحب کے الفاظ میں:

"ہندوستان بھوکوں مر رہا ہے کپڑا غلہ گھی کمیاب سے کمیاب تر ہوتا جارہا ہے

---

(۱) صدق لکھنؤ، ۱۷مارچ ۱۹۴۷ء

اور وہ بھی مفسر قرآن صاحب تذکرہ محی الدین مولانا ابوالکلام عہد آفریں عہد میں
(انھیں کی زبان سے موسیقی و رقص کے لئے سرکاری خزانہ کے اصراف کا اعلان)
بد نصیب مسلمان اپنے نصیب کو کہہ کر روئے اور اپنے دل کو کیا کہہ کر تسلی
دے"(۱)

دہلی کے بعد لاہور جو کہ اردو کا بھی سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا بہت سے اخبار جاری ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں 'احسان' جاری ہوا۔ اس اخبار کو علامہ اقبال کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کی ادارت میں چراغ حسن حسرت اور مرتضیٰ احمد خاں میکش شامل تھے۔ یہ پہلا روزنامہ اخبار تھا جس نے اپنے دفتر میں ٹیلی پرنٹر نصب کرائے۔ اس کے قبل اخبارات کی خبریں دستی بھیجی جاتی تھیں۔ لاہور ہی سے 'فریڈم' اخبار نکلا جو عوام میں بے حد مقبول تھا۔ یہ سہ روزہ اخبار تھا۔ اس کے علاوہ 'پاسباں، تریاق اور مساوات' بھی نکلے جو سرمایہ کی کمی سے زیادہ دن تک چل نہین سکے۔

۱۹۳۸ء میں پٹنہ سے صدائے عام نذیر حیدر نے نکالا جو اب تک جاری ہے۔ ارو کا ایک معیاری اخبار 'قومی آواز' جو جواہر لال نہرو کی سرپرستی میں ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا اس کے بانی مدیر حیات اللہ انصاری تھے۔۔ یہ اخبار اپنے آپ میں ایک مکمل اخبار ثابت ہوا۔ کانگریس جب تک برسر اقتدار رہی یہ اخبار پھلتا پھولتا رہا لیکن اقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد قومی آواز کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ لکھنؤ سے تو بند ہو گیا لیکن دہلی کے آج بھی کسی نہ کسی طرح جاری ہے۔

---

(۱) صدق لکھنؤ، مارچ ۱۹۴۷ء

باب پنجم

اردو صحافت

(آزادیٔ ہند) ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک

ایک غلام ملک کے لئے آزادی سے بڑھ کر اور کون سی نعمت ہو سکتی ہے لیکن ہندوستان نے انگریزوں کی غلامی کا طوق اتارا تو اس کے جسم پر لاکھوں بے گناہ اور معصوم لوگوں کا خون تھا۔ یہ خون ان فرقہ وارانہ فسادات کا پھل تھا جس کے بیج برطانوی حکومت نے بوئے تھے۔ سہیل وحید کا کہنا ہے

> ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیاں نفرت کا یہ بیج انگریزوں نے اپنی پالیسی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کے تحت پہلے بودیا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں پہلی بار تحریک آزادی کے بعد انگریزوں کی سمجھ میں یہ آگیا تھا کہ جس دن یہ دونوں قومیں ایک ہو جائیں گی اس دن انگریزی راج ایک دن نہیں چلے گا۔ لہٰذا انگریوں نے بڑی شاطرانہ چالوں سے ان دونوں قوموں کے درمیاں نفرت کی دیوار چنناشروع کر دیا۔''(۱)

اس فرقہ وارانہ منافرت کے پودے کی آبیاری میں ہمارے بعض لیڈروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قوم پرستی کے جذبہ کو خوب فروغ دیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوریاں دن بہ دن بڑھتی چلی گئیں۔ اس سلسلے میں محمد ذاکر لکھتے ہیں۔

> ''یہ تفریق پسندی دراصل ایک تہذیبی مسئلہ تھا جس سے سیاسی رہنماؤں نے فائدہ اٹھایا۔ اس کا سراغ لگانے کے لئے ہندوستان میں قومیت پرستی کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہئے جوں جوں قومیت پرستی اور قومی شعور بڑھتا گیا ہندو اور مسلمانوں دونوں کو اپنی اپنی شوکت پارینہ کا خیال آنے لگا اور احیائیت کے رجحان ترقی پانے لگے۔''(۲)

ہندوؤں اور مسلانوں کی اس تفریق سے ہندوستان میں ایک نئ قسم کی سیاست کو وجود ہوا جو مذہبی کٹر

---

(۱) صحافتی زبان ڈاکٹر سہیل وحید صفحہ ۱۵۴

(۲) آزادی کے بعد کا ہندوستان کا اردو ادب، ڈاکٹر محمد ذاکر ص ۶۲

پسندی سے عبارت ہے اور جو ہندوستان کی تقسیم کا باعث بنی یہی نہیں بلکہ آزاد ہندوستان میں بھی اس اثر مرتب ہوا۔ نتیجے کے طور پر کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلافات اپنی انتہا کو پہونچ گئے اور حالات بے قابو ہو گئے۔ کشمکش کی وجہ سے مفاہمت کے تمام دروازے بند ہو گئے اور ١٦اگست ١٩٤٦ سے فرقہ پرستی کے ناگ نے پورے شمالی ہندوستان کو ڈس لیا اسی دوران حکومت برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ وہ جون ١٩٤٨ تک ہندوستان کو آزاد کر دے گی۔ ایک طرف آزادی کی تیاریاں ہونے گیں دوسری طرف ہندوستان کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والے خون خرابے نے ہندوستان کی تاریخ کے دامن پر بد نما داغ لگا دیا۔ ہندوستان کے آخری واسرائے سر لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک طرف ١٥اگست ١٩٤٧ کو ہندوستان کی آزادی کا دن مقرر کیا تو دوسری طرف حکومت برطانیہ نے ٨جولائی ١٩٤٧ کو ہندوستان کی تقسیم کے قانون پر دستخط کر دیا۔ تقسیم کے اعلان اور اس سلسلے میں کی جانے والی عجلت کے نتیجے میں جو خون خرابہ ہوا اس کے زخم آج بھی نہیں بھرے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ذاکر لکھتے ہیں ۔

> "برما کو ہندوستان سے علاحدہ کرنے میں تین سال لگ تھے۔ ممبئی کو سندھ سے الگ کرنے میں دو سال اور اڑیسہ کو بہار سے الگ کرنے میں دو سال لگے۔ اس کے برخلاف اتنے بڑے ملک یعنی ہندوستان کی تقسیم میں صرف ڈھائی مہینے لگے۔"(١)

آزادی کے بعد ہندوستان میں لسانیاتی فرق نے جس طرح شدت اختیار کر لی اس سے اردو کو سب سے گہرا دھچکا پہونچا۔ ہندی کو سرکاری زبان بنانے کی سرکاری اور غیر سرکاری مہم نے جس طرح اردو کو نشانہ بنایا اور اردو والے احساس جرم میں مبتلا ہو گئے۔ المیہ ہے کہ آزادی کے لئے جس اردو زبان اور اردو صحافت نے ایک انقلاب آفریں رول ادا کیا تھا، آزادی کے بعد سب سے معتوب و مقہور ٹھہری۔ اگرچہ اردو نے ہندوستان میں گنگا جمنی

---

(١) آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب ڈاکٹر محمد ذاکر صفحہ ٦٧

تہذیب کو فروغ دیا اور آزادی سے پہلے یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عام زبان تھی لیکن تقسیم کے بعد اردو کو صرف مسلمانوں سے جوڑ دیا گے اور اردو کو ہندی کی حریف اور اس کے لئے خطرہ سمجھا جانے لگا۔ ہندی کے مقابلے اس کے فروغ اور ترقی کی تمام راہیں مسدود کی جانے لگیں۔ ہندوستان کے عوم کو یہ بات سمجھائی جانے لگی کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور تقسیم ملک کی ذمہ دار ہے اسے لوگ لسانیاتی تقاضوں کو نظر انداز کر کے صرف اقلیتی فرقے کو نقصان پہونچانے کے جذبہ کے تحت یہ سب کہتے رہے۔

شمالی ہند کئی صوبوں میں جہاں اردو بولنے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں وہاں اس کو سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا گیا۔ سرکاری دفتروں میں اس کا چلن ختم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر محمد اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"وطن پرستی کے نام پر قومی عصبیت، جارحیت، امن دشمنی اور قومی یکجہتی کے نام پر اقلیتوں کی زبان، تہذیب اور وجود کو خطرے لاحق ہونے لگے۔"(۱)

اردو دشمنی کے نتیجے کے طور پر اخبارات ورسائل دم توڑنے لگے اور اشاعت گھر بند ہونے لگے۔ ایک اندازے کے مطابق آزادی سے قبل صرف دہلی میں ہی اردو کے چھوٹے بڑے ۱۴ روزنامے تھے جن میں ۱۱ کے مالک اور مدیر مسلمان تھے۔ آزادی کے بعد ان ۱۱ میں سے ۹ تو یہیں بند ہوگئے بقیہ اپنی دوکان بڑھا کر نقل وطن کر گئے اس صورتحال کا ڈاکٹر محمد حسن نے اس طرح جائزہ لیا ہے۔

"اردو اقلیت کی زبان ہونے کے باعث اکثریت کے غیض وغضب کا شکار تھی اردو کو ہندی کے لئے خطرہ سمجھا جا رہا تھا اور اسے ملک کی قومی مرکزیت کے منافی قرار دیا جا رہا تھا اس کی تعلیم محدود ہوتی جا رہی تھی۔ رسالے دم توڑ رہے

---

(۱) صحافتی زبان۔ ڈاکٹر سہیل وحید صفحہ ۱۶۶

تھے اور اشاعت گھر بند ہو رہے تھے اور یہ صورتحال ہنوز قائم ہے اور لکھنے والا نہیں
جانتا کہ اس کی زبان کا مستقبل کیا ہے اور مستقبل کی ضمانت حاصل کرنے کے لئے وہ
کس کی مدد چاہے؟ کیونکہ سرمایہ دار طبقہ قوم اور قومی مفاد (یعنی سرمایہ داری کی
تاجرانہ مصلحتوں اور جبری لسانی وحدت کے پیش نظر) اقلیت کی زبان اور اس کے کلچر
کی قربانی چاہتا ہے۔"(۱)

اردو صحافت کے بارے میں پہلا علم تو یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی کے دوران اپنی نوعمری میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد معتوب بھی سب سے زیادہ یہی ہوئی۔ اس وقت ۳۵ میں سے صرف ۱۲ اخبارات ہی بچے کیونکہ لاہور، دہلی اور لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبارات اور ان کے مالکوں کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گذرنا پڑا ستم ظریفی یہ کہ اردو صحافت کے ساتھ ملک کی آزادی کے بعد بھی یہی رویہ رہا۔ تقسیم کے بعد پاکستان کا سارا غصہ ہندوستانی مسلمانوں پر اتارا جانے لگا جبکہ پاکستان میں بھی اردو کے تئیں تعصب بر قرار ہے اس سلسلے میں سہیل وحید لکھتے ہیں۔

"اردو ہندوستان کی زبان ہے اور ہندوستان سبھی کا ہے۔ ہندوؤں کا بھی اور
مسلمانوں کا بھی۔ پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کا بھی یہاں اثر پڑا۔ اس کے
باوجود کہ پاکستان کے کسی خطے کی زبان اردو نہیں تھی وہاں اردو کو سرکاری زبان بنایا
گیا پاکستان میں آج بھی اردو کے ساتھ وہی علاقائیت دیوار بن کر کھڑی ہے
جو ہندوستان میں ہے۔"(۲)

---

(۱) جدید اردو ادب محمد حسن (مضمون) صفحہ ۲۰۵

(۲) صحافتی زبان، سہیل وحید، ص ۱۶۶

آزادی ملنے کے بعد ہندوستان کے آئین کی بنیاد سیکولرازم پر رکھی گئی جہاں تمام مذاہب کو مکمل آزادی کی گارنٹی دی گئی لیکن آزادی کے بعد سب سے زیادہ غلط استعمال اس آزادی کا ہوا اور ملک کی سیکولر حیثیت صرف کاغذی ہو کر رہ گئی۔ یہاں ہر مذہب کے ماننے والے موجود ہیں لیکن ملک کی تہذیب ولسانی رنگارنگی اکثریتی فرقہ کے ایک بڑے حصہ کے حلق سے نیچے نہیں اترتی اور یہ طبقہ جمہوریت کی آڑ میں فاشزم کا خواب دیکھنے لگے اور مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کی جارحیت پر تیار ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ چونکہ جمہوریت میں ہر فیصلہ اکثریت کی رائے سے ہوتا ہے اس طرح وہ سادہ اکثریت کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر کے اقلیتوں سے الگ اور ان کا حریف بنا سکتے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہر طرح کے حیلے اور بہانے سے مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرایا جانے لگا جس کے نتیجہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت میں عدم تحفظ کا احساس حاوی ہونے لگا۔

انگریزوں نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے ہندوستان کے دونوں فرقوں کے درمیان تفریق کی جو پالیسی اختیار کی تھی بعض مفاد پرست ہندوستانی سیاستدانوں کو یہ فائدہ کا کاروبار لگا۔ یہاں یہ بات کہنا بے جانہ ہوگا کہ سر سید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی اور سماجی پسماندگی دور کرنے کی جو کوششیں کی اس کے خاطر خواہ نتائج برامد ہوئے لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہوا جو توازن کھو بیٹھا۔ مادہ فائدہ کے لئے اس نے نہ صرف اپنا رشتہ اپنے اقدار، اپنی روایات اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے منقطع کر لیا بلکہ مسلمانوں کی زبوں حالی کی تمام ذمہ داری خود مسلمانوں کے سر ڈال دی اور ہر معاملے میں مسلمانوں کو ہی قصوروار ٹھہرانے کا ڈھب نکال لیا۔

ایسی صورتحال میں جب کہ مسلمانوں کی سیاسی وسماجی سرپرستی کرنے اور ان کا اعتماد بحال کرنے والی قیادت کا بھی فقدان ہو گیا تھا اسوقت اردو صحافت پر ایک بڑی ذمہ داری آن پڑی۔ اردو اخبارات ورسائل سے یہی توقع

تھی کہ وہ مسلمانوں کے علمی ذوق اور ان میں صحتمند رجحانات کو پروان چڑھاتے اور تقسیم کے لئے مسلمانوں کے ذہن ودماغ میں تھوپے گئے احساس جرم کی نفسیات کی گرہیں کھولتے اور ان میں اعتماد بحال کرنے والی تحریکیں اٹھاتے مگر یہ اس وقت ممکن تھا جب اردو صحافت شوق وجذبہ اور اصول کی حامل ہوتی اور اس کے سامنے کوئی نصب العین ہوتا اور کچھ اعلیٰ مقاصد ہوتے جیسا کہ ماضی میں اردو اخبارات کے مدیروں کا طرز رہا تھا۔

آزادی کے بعد کچھ ایسے اخبارات سامنے آئے جنھوں نے ہندوستان کے جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں کا ایک طرح سے جو شیرازہ بکھر گیا تھا اور ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی انھیں آرزوؤں میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکنے اور ان کے ذہن کو صاف کرنے کی جدوجہد کی۔

آزادی کے بعد اردو صحافت تین خانوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔اردو اخبارات اور صحافیوں کا ایک بڑا حلقہ حکمراں جماعت کے دامن عافیت میں رہ کر سیکولرازم اور جمہوریت کا نغمہ سرا بن گیا اور سیکولرازم کے نام پر مسلمانوں کو اپنی اصول پسندی کو ترک کر کے مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کرنے کا مشورہ دینے لگا اور یہ مشورہ کبھی کبھی دھمکی کا لہجہ بھی اختیار کر لیتا۔ سیکولر مسلم اخبار نویس اس طرح کی دھمکی دینے لگے کہ ''جس نے اب تک نہ سمجھا ہے سمجھ لے کہ ہندوستان کا بیڑا صرف کانگریس ہی پار لگا سکتی ہے۔ ورنہ وہ لوگ جو ہندوستان کے درپردہ دشمن ہیں اور پاکستان بنانے کے ذمہ دار اور ان کے ایجنٹ ہیں (اشارہ کانگریس مخالف مسلمان لیڈروں کی طرف)وہ بیڑہ کیا پار لگائیں گے پہلے اپنی خیر منائیں'' بعض اردو اخبارات جہاں اس طرح کی بات کہہ کر مسلمانوں میں احساس جرم پیدا کرنے کی کوشش میں لگے رہے وہیں دوسری طرف یہ ہوا کھڑا کیا جاتا رہا کہ مسلمانوں کے لئے سیکولرازم بہت ضروری ہے کیونکہ ہندوستان کی ساخت کو دیکھتے ہوئے یہاں سیکولرازم

کو ہٹا کر جو چیز آسکتی ہے وہ گول والکر کا ہندوراج ہے۔ایسے اخباروں اور ان کے مدیروں نے مصلحت کوشی کے باعث اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ نئی زندگی اور نئے حالات کو سمجھنے سے مسلمان قاصر ہیں اور اپنی گہری مذہبیت کی وجہ سے ملک کی اور خود اپنی بھی ترقی میں روڑہ بن رہے ہیں۔جہاں تک مسلمانوں کو درپیش مسائل کی بات ہے تو اس سلسلے میں حکومت وقت اور حکمراں طبقے کے پرفریب وعدوں میں ہی مسلمانوں کو الجھاتے رہے اور سارازور اسی پر صرف کرتے رہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل ہندوستان کے دستور اور قانون کی مہیا کی ہوئی سہولیات میں مضمر ہے۔اگرچہ اردو اخبارات میں اس بات کو خوب مشتہر کیا گیا لیکن دستور اور قانون کی مہیا کی ہوئی سہولیات اور انہیں دئے ہوئے حقوق کی مسلمانوں تک براہ راست پہونچنے کی سبیل کیا ہو اس کے بارے میں عام طور پر خاموشی اہی اختیار کی گئی اور ساتھ ہی ساتھ اکثریت کے ذہن اور دل ودماغ میں جمے ہوائے اس خیال کو نکالنے کے کی کوشش نہیں کی گئی کہ جب مسلمانوں نے اپنے حصے کا ملک بٹوارے کے ذریعہ الگ کر لیا تو انہیں کیا حق حاصؒ ہے کہ وہ غیر مسلموں کے حصے میں اپنا حصہ لگانے کے لئے اصرار اور تقاضے کی روش اختیار کریں۔اگر یہ احساس صرف اکثریت کے احساس تک محدود رہتا تو اس کی کوئی صورت شاید نکل سکتی لیکن اکثر وبیشتر مسلم لیڈروں، صحافیوں اور عام مسلمانوں کے دلوں میں اپنے آپ کے غیر مستحق ہونے کا احساس حاوی دکھائی دیتا ہے۔اپنے آپ کو غیر مستحق بلکہ مجرم سمجھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ مسلم صحافت کو دستور اور قانون کی دہائی دینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور فطری اور پیدائشی حق پر اصرار کرنے کی جرأت بہت کم ہوئی۔

اردو صحافت کا دوسرا طبقہ وہ رہا جس نے مسلمانوں کے بنیادی مسائل کو نظرانداز کر کے فروعی مسائل کو خوب اچھالا اور اشاعت کو بڑھانے کے پیش نظر رکھتے ہوئے جذبات کو ابھارنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی

بھرپور کوشش کی۔ کوشش یہی کی گئی کہ ہر وہ مسئلہ کھڑا کر دیا جائے جو واقعی حقیقی مسئلہ نہ ہو۔ویسے بھی دیکھا گیا ہے کہ دنیا بھر میں نوے فیصد مسائل ایسے ہیں جنھیں اغراض پسندوں نے اپنے مخصوص مقاصد کے لئے پیدا کیا اور انسانیت کو اس میں الجھادیا۔ آزادی کے بعد مسلم صحافت کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہی تھا کہ وہ مسائل کے انتخاب میں کیا موقف اختیار کرتی ہے۔ لیکن وہ اس چیلنج جا سامنا کرنے میں ناکام رہی اور صحافت کے میدان میں اتنی ترقی ہونے کے باوجود جذباتی موضوعات کے اردگرد ہی طواف کرتی رہی اور ملکی، قومی اور ملی مسائل میں کامیاب رول ادا کرنے سے قاصر رہی۔بس ملت کے خلاف کئے جانے والے قانونی اور غیر قانونی اقدامات پر واویلا کرنا شروع اور شور مچانا اس کا وطیرہ وشعار رہا اور وہ مسلم مسائل کا اچھا خاصا ماتمی پوسٹر بن گئی۔

اس میں شک نہیں کہ آج بھی اس قسم کے اردو صحافت بہت گرم اور پر شور ہے تاہم یہ بھی درست ہے کہ اس نے اہم موضوعات پر رائے عامہ کو ابھارا بھی ہے لیکن سنگین حالات میں کس طرح عوام کا اعتماد بحال رکھنا ہے، کس طرح انہیں جائز اور صحیح مقام دلانا ہے، اس سے وہ نابلد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم صحافت کا ایک بڑا حصہ احساس کمتری کا شکار ہو کر آہستہ آہستہ سمجھوتہ پر اتر آیا ہے۔ آج کتنے ہی اردو روزنامچے اور ہفت روزہ اخبارات سیاسی پارٹیوں کے مفادات کے لئے کام کر رہے ہیں اور ان سیاسی جماعتوں کی جا و بیجا تائید اور ان کی پالیسیوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر ان کے حق میں طرح طرح کے جواز مہیا کر کے اپنے ضمیر اور صحافی کے قلم کی آبرو بیچ رہے ہیں۔ نتیجہ کے طور پو آج اردو کے ایسے اخبارات ایک طرح سے ناپید ہو کر رہ گئے ہیں جو قومی اور ملی مسائل پر مسلمانوں کے موقف کو موثر طور پر پیش کر سکیں۔ مسلم صحافت محض دوسروں کی متعصّبانہ ذہنیت کی وجہ سے نہیں بلکہ کچھ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں سبب کم آواز اور بے وزن ہو کر رہ گئی ہے۔

مشہور صحافی بارنی مین کے قول کے مطابق ”اخبار نویس دنیا میں ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لئے پیدا

ہوا ہے جو مصائب میں ہوں اور ان لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں جو عیش و آرام میں ہوں۔'' تقسیم سے قبل اردو صحافیوں نے اس قول کو اپنی زندگی میں اتار لیا تھا یہی وجہ ہے کہ اس دور کے اخبارات ورسائل کے مدیروں نے مذہبی، سماجی، علمی اور سیاسی دائروں میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے لیکن آزادی کے بعد اردو صحافت پیشہ وارانہ مفادار میں الجھ کر رہ گئی اور بالعموم صحافت کا انداز خالص کاروباری بن کر رہ گیا۔ 'ہم خرما و ہم ثواب' کے مصداق اکثر اردو اخبارات کے مالکوں اور ایڈیٹروں کے لئے جہاں صحافت ایک طرف حصول زر کا ذریعہ بن گئی وہیں دوسری طرف اپنی سماجی اور سیاسی پوزیشن مستحکم کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔ ایسے لوگوں نے صحافت کے تمام اصولوں کو پامال کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ آج بالعموم مسلم صحافت اس درجہ پر ہے کہ کتنے ہی مشہور اخبارات اور رسائل کے مالک محض اس لئے ایڈیٹر ہیں کہ ان کے پاس صحافیوں کا پیٹ بھرنے کے لئے سرمایہ موجود ہے ورنہ انہیں ان اخبارات میں لکھی جانے والی تحریروں سے اس سے زیادہ تعلق نہیں رہتا جو کسی ورکشاپ میں تیار کی جانے والی مصنوعات سے ورکشاپ کے مالک کو ہوتا ہے۔ اس ورکشاپ کی بھٹی میں نہ جانے کتنے باصلاحیت لوگ ایندھن بن گئے لیکن سب سے زیادہ نشانہ وہ تعلیم یافتہ نوجوان بنے جن میں تکنیکی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ جو دیہی علاقوں سے تلاش معاش کے لئے ہجرت کر کے شہر پہونچے تھے اور جن کے پاس اچھی نوکریوں کے لئے رشوت اور سفارش کے نام پر کچھ نہیں تھا۔ اخبارات میں اپنی زندگی کھپانے والے بیشتر لوگ اس خیال سے متفق ہیں کہ بیشتر اردو اخبارات کے مالکوں کا رویہ اپنے کارکنوں کے ساتھ اس جیسا بھی نہیں تھا جیسا یہودی سرمایہ داروں کا اپنے نوجوانوں کے ساتھ تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ اس میں اس سارا قصور صرف اخبار مالکوں اور ایڈیٹروں کا ہی ہے جو دوسروں کی تحریروں کے بل پر شہرت اور سرمایہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی سماجی اور سیاسی حیثیت مستحکم کرتے رہے بلکہ اس

میں کہیں نہ کہیں ان اردو صحافیوں کی کمزوری ہے جنہوں نے قلم فروشی کو ایک پیشہ بنالیااور صحافت کو مزدوری جیسے زمرے میں لا کھڑا کیا۔ ایسے صحافیوں نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ صحافت کا کوئی خاص نظریہ بھی ہوتا ہے اور معاشرے پر اس کے دوررس اثرات بھی مرتب ہوتے ہوتے ہیں۔ تمام صحافتی ذمہ داریوں سے دستبردار ہوتے ہوئے محض انشا پردازی کو ہی صحافت کے لئے کافی سمجھا گیا۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض یا مناسبت نہیں تھی کہ جو کچھ وہ صحافت کے نام پر پیش کررہے ہیں۔ وہ ان کے نظریہ اور ضمیر کے مطابق ہے یا نہیں بلکہ اتنی تسکین کافی سمجھ لی گئی کہ جو ان کے نام سے نہیں آرہا ہے ان کو کیا فکر کہ وہ کس درجہ اور کس معیار کی چیز ہے۔

آزادی کے بعد اردو صحافت میں ایک تیسرا طبقہ وہ بھی سامنے آیا جس نے اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے ملک اور ملت کو فساد انتشار سے بچانے کے لئے جرأت رندانہ کا مظاہرہ کیا۔ ایک طرف تو اس نے ملت کی تہذیبی شناخت کو برقرار رکھنے کے لئے قلم سے تلوار کا کام لیا دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں میں خود اعتمادی اور یقین کا اجالا پیدا کرنے کے لئے تحریروں کے چراغ روشن کئے۔ صحافت کو ایک مشن کے طور پر استعمال کرنے والے اس طبقے نے صحافت کو علم وادب ، داستان وحکایات، عبرت اور حق گوئی وبیباکی کا ترجمان بنادیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو نشانہ بنا کر کئے جانئے والے حملوں اور اشتعال انگیزیوں کا انہوں نے مدلل جواب دیا۔ ان کی صحافت نہ تو ردعمل کی صحافت رہی اور نہ چیخ پکار کے قائل رہے۔ اس زمرے میں مولانا عبدالماجد دریابادی، محمد عثمان فارلقلیط اور محمد مسلم جیسے صحافیوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ایک ایسے نازک وقت جب ایک طرف فرقہ پرستوں کی جانب سے مسلمانوں کی مذہبی شناخت، زبان، تعلیمی اداروں اور ثقافت واقدار پر یلغار شروع ہوگئی تھی، ہولناک فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، پرسنل لا پر تیر اندازی ہونے لگی اور ہر معاملہ میں اقلیتوں اور مسلمانوں کو ملزم وقصووار ٹھہرانے کی روش اختیار کرلی گئی تھی ایسے میں ان مٹھی بھر صحافیوں نے نہایت بے خوفی سے وہ کارنامہ

انجام دیا جس سے مسلمانوں میں خود اعتمادی اور یقین کی کیفیت پیدا ہوئی اور نئی نئی تحریکیں وجود میں آئیں ۔انہوں نے تمام اشتعال انگیزیوں کے جواب میں چیخ وپکار اور واویلا مچانے کے بجائے سنجیدگی اور متانت کا لہجہ اختیار کیا۔ سخت سے سخت اشتعال انگیزی کا جواب متانت وظرافت سے اس طرح دیا کہ اشتعال انگیزی کے غبارے کی ہوا اپنے آپ کل نکل گئی۔ان صحافیوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور گروہوں کو ہدف ملامت بنانے کے بجائے ملی مسائل کے حل کے لئے تمام باشندگان ملک کے درمیان اتحاد وخیر سگالی کا پیغام دیا۔ مسلم مجلس مشاورت کا قیام ایسے ہی سنجیدہ صحافیوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اسّی (۸۰) کے دہائی آتے آتے سیاسی اتار چڑھاؤ ایسے ایسے سنگین مسائل پیدا کر دئے جس سے ہندوستان کا سماجی نقشہ ہی بدل گیا۔ شاہ بانو کا معاملہ، بابری مسجد کا تنازعہ، مسلم پرسن لا اور اردو کا معاملہ اور کشمیر کی شورش کے باعث مسلم عوام ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگئے۔ دوسری طرف کچھ انتہا پسند ہندو جماعتوں نے ان سب واقعات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج کو وسیع کر دیا ۔ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب داغدار ہو گئی۔ ''ہندی ہندو ہندوستان'' کے نعرے بلند کئے جانے لگے۔ غریب اور غیر تعلیم یافتہ مسلمان فرقہ وارانہ دنگوں میں کام آتے رہے۔ ایسی صورت حال میں وہ ہندوستان میں اپنے وجود کو نیز اپنی حیثیت اور مقام کے بارے میں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور ہیں۔ ایسے میں اردو صحافت سے یہی توقع تھی کہ وہ ایک طرف مسلمانوں میں بے سمتی اور کشمکش کی کیفیت سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کرتی اور ان مسائل کو حکمراں طبقے تک بہت موثر ڈھنگ سے پہنچاتی لیکن اردو کے بیشتر اخبارات اور صحافیوں کی اصلی حالت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مفاد کے لئے مختلف سیاسی جماعتوں اور ان کے لیڈروں کا دامن تھام رکھا ہے اور وہ ان سیاسی جماعتوں کے لئے مسلم ووٹوں کی ٹھیکے داری کرنے لگے ہیں۔

آزادی کے بعد اردو صحافت کی زبوں حالی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ ادیبوں، دانشوروں اور مفکروں کی اس سرپرستی سے محروم ہو گئی جو آزادی کے پہلے اسے حاصل تھی۔ اسے اردو کاالمیہ ہی کہا جائے گا کہ آزادی کے بعد بیشتر ادیبوں اور قلم کاروں نے اردو صحافت کو قابل اعتنانہ سمجھ کر اسے پس پشت ڈال دیا اور گردو پیش کے کرب اور ہولناکی سے بے خبر ہو کر فکر و خیال کے سنہرے جزیرے آباد کرنے میں لگ گئے جس کے نتیجے میں اردو ادب کی سرگرمیاں اکادمیوں اور دانشگاہوں تک محدود ہو کر رہ گئیں جہاں ادب تفریح طبع کے ساتھ ساتھ دانش وارانہ رعب و جلال اور نظریاتی وابستگی کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔ اس کی کی وجہ یہ تھی کہ بیشتر اردو ادیبوں کو بائیں بازو یا دائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کا چھتر سایہ مل گیا۔ نئ نئ اکادمیوں اور اداروں سے ان پر خوب انعامات کی بارشیں ہونے لگیں۔ دوسری طرف اردو صحافت تقسیم ملک کی تہمت اور سرمائے کی سرپرستی سے محروم ہو جانے کے باعث تذبذب اور بحران کا شکار ہو گئی۔ پھر رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب ایک طرف اردو زبان کی تعلیم و تدریس کے نظام کو درہم برہم کر کے اردو ادب کا عوامی حلقہ محدود سے محدود تر کر دیا گیا تو دوسری طرف اردو زبان کو غیر ملکی ٹھہرا کر دیس نکالا دینے کی کی پوری کوشش کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے بعد تیسری نسل اردو زبان سے نابلد ہو کر اپنی تاریخی تہذیبی اور ثقافتی وراثت سے محروم ہو گئی۔ یہی نہیں جب اردو رسم الخط کو بدل کر دیوناگری کر دینے کا فتنہ پیدا کیا گیا تو ہمارے کئی چوٹی کے ادیبوں اور نقادوں اپنے آقاؤں کی خوشنودی میں اس کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کے اردو زبان اور صحافت کی گردن مار دینے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

وہ تو کہئے کہ تمام نامساعد حالات کے باوجود اردو اخبارات ورسائل نے اس دور کے مسائل سے خود کو ہمکنار اور اردو کا رشتہ عوام سے برقرار کھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کانٹوں بھری راہوں میں نہ معلوم آبلہ پا

کام آگئے۔ آزادی کے بعد درجنوں ایسے صحافی ہوئے ہیں جرأت رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو پڑھنے والوں خاص طور پر مسلمانوں میں اعتماد اور حوصلہ بحال کرنے کی بھرپور کوشش کی بلکہ اردو کے حُوق کی بازیافت کے لئے اپنے قلم کو خنجر بنالیا۔ اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہوگا کہ کسی زندہ قوم اور زندہ زبان کا ادب صرف دانش گاہوں میں پرورش نہیں پاسکتا۔ وہ بازاروں، کھیتوں، کھلیانوں اور محنت کشوں کے لہو گرم رکھنے والی کارگاہوں ہی برگ وبار لاسکتا ہے ادیبوں اور نقادوں کی اس بات سے انکار نہیں ہے کہ آزادی کے بعد صحافت کا وہ معیار نہیں رہ گیا جو آزادی کے پہلے تھا۔ اس کی وجہ تو سامنے ہی ہے کہ جب صحافت کو دوئم درجے میں ڈال کر قلم کاروں کے ایک بڑے طبقے نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی تو اس کا پہلے جیسا بلند معیار کیسے قائم رہ سکتا ہے لیکن اردو قلم کاروں پر بھی تو یہ بات کھری اترتی ہے کہ گذشتہ تابناک دور کے مقابلے میں جدید دور کے قلم کاروں نے اپنی امتیازی شناخت نہیں بنائی اور وہ کوئی عہد ساز کارنامہ انجام نہ دے سکے

ہندوستان میں مردم شماری کے اعداد وشمارے کے مطابق تقریباً ۴ کروڑ لوگ اردو زبان سے واقف ہیں جن میں ایک فیصد سے بھی کم لوگ اردو ادب وشاعری کی کتابوں سے استفادہ کرپاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ اردو والوں کی اقتصادی بدحالی ہے لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر کتابیں عام پڑھنے والوں کے لئے نہیں بلکہ لائبریریوں کی زینت بنے کے لئے کسی اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک اندازے کے مطابق اخبارات ورسائل کی اشاعت تقریباً ۲۵ لاکھ ہے۔ ایجنسیوں نے جو جائزہ لیا ہے اس کے مطابق ہر اردو اخبار کم از کم دس افراد پڑھتے ہیں۔ اس طرح اردو اخبارات تقریباً دو کروڑ لوگوں کو اپنے حلقہ اثر میں لیتا ہے۔ اگرچہ یہ تعداد بھی بہت کم ہے لیکن اس میں اضافہ کی کافی گنجائش ہے۔ اردو صحافیوں کی مسلسل کوششوں اور جد جہد سے اردو والے تذبذب کی کیفیت سے باہر آگئے ہیں۔ انقلاب زمانہ اور بدلتی ہوئی سیاسی

وسماجی فضامیں مسلمانوں میں اب وہ احساس جرم بھی نہیں ہے جو تقسیم کے بعد ان کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔اسی لئے ایک عرصہ سے سیاسی، سماجی اور لسانی جمود کی جو کیفیت تھی وہ ایک امید کی کرن میں بدل رہی ہے۔اردو والے اب حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور نہیں بلکہ حالات کو سازگار بنانے کے لئے کوشاں اور سرگرم عمل ہیں۔حالیہ برسوں میں اردو صحافت کی خدمات کے اعتراف کے طور پر کچھ اہم تصانیف سامنے آئیں اور صحافت کے مختلف پہلوؤں پر مباحثے اور سمینار ہوئے جس سے حالات امید افزاد کھائی دیتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ آج کے صحافتی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اخبارات اچھے لکھنے والوں کی خدمات حاصل کریں۔اس سے اردو صحافت کا اعتبار بڑھے گا۔دوسری طرف اردو کے دانشور حضرات صحافت کے تئیں معاندانہ رویہ ترک کر کے اسے اردو کے فروغ کا ذریعہ اور اہم مسائل کو موضوع بنائیں تو یہ اردو کو عوام میں زندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی کا وسیلہ بھی بن سکتی ہے۔

قومی آواز

نہرو کی قیادت میں مسلم لیڈران اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی خیر و عافیت کانگریس کے سیکولرزم کے پرچم تلے ہی ممکن ہے۔ مسلمانوں کو کانگریس کی طرف مائل اور وابستہ کرنے کے لئے اسوسی ایٹیڈ جرنلس لمیٹیڈ نے ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ سے قومی آواز جاری کیا۔اس کمپنی کے وہی اصول تھے جو کانگریس کے تھے۔اس کام میں نہرو کے ساتھ رفیع احمد قدوائی، موہن لال سکسینہ اور حیدر حسین پیش پیش تھے۔اس اخبار نے کانگریس کی پالیسیوں کی کھل کر حمایت کی۔کانگریسی رہنماؤں کے نظریات کی خوب تشریح کی۔ آزادی کے تئیں اس اخبار نے مسلمانوں کو واضح طور پر آگاہ کیا کہ مسلمان کانگریس کے خلاف ہوئے تو سخت نقصان میں رہیں گے۔ آزادی کے بعد بھی مسلمانوں کو یہی سبق پڑھانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ہاں یہ ضرور ہے اردو زبان کا

جہاں کوئی معاملہ درپیش آیا، قومی آواز نے اردو کے حق میں اپنی آواز بلند کی۔

قومی آواز کے بانی ایڈیٹر حیات اللہ انصاری تھے وہ اس سے قبل کمپنی سے شائع ہونے والے اردو ہفت روزہ ہندوستان کے بھی ایڈیٹر تھے جنہوں نے اسے انگریزی اخبارات کے ہم پلہ بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ چونکہ حیات اللہ انصاری افسانہ نگار اور ناول نگار تھے اس لئے ان کی کوشش یہی رہی کہ قومی آواز کی زبان میں اردو نثر کی خصوصیات موجود رہیں۔ چونکہ اس اخبار کے عملے میں ایسے لوگوں کی اکثریت تھی جو کسی نہ کسی صورت سے ادب سے وابستہ تھے اس لئے اس بات کی کوشش کی گئی کہ اس کی زبان میں سادگی اور حسن برقرار رکھا جائے اور صحافتی معیار کے مطابق زبان کو استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں سہیل وحید لکھتے ہیں :

> "مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، سر سید احمد خاں اور گاندھی جی سبھی نے ہندوستان میں لسانی ٹکراؤ کے امکان کا اندازہ کر لیا تھا اس لئے ان سبھی نے اپنے تئیں اس بات کی کوشش کی تھی کہ زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان بنایا جائے۔ سر سید احمد خاں نے عملی طور پر اس تحریک کو تقویت پہنچائی۔ گاندھی جی نے اس کو باقاعدہ تحریک کی شکل دی اور قومی آواز نے سر سید کے لسانی اصولوں اور گاندھی جی کے تصورات کی پاسداری کی۔" (۱)

اردو نثر کا یہ سنہرا دور کہا جائے گا جب سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی کے افسانوں اور ناولوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ شاعری میں بھی مجاز، حفیظ جالندھری، مجروح، ساحر، جذبی اور خمار اور جوش کی غزلوں اور نظموں کی دھوم مچی ہوئی تھی ایسے دور میں قومی آواز نے اپنے لئے جگہ بنائی اور اس

---

(۱) صحافتی زبان۔ سہیل وحید صفحہ ۱۸۹

فرق کو کہ اخبار کی زبان وہ نہیں جو ادب کی زبان ہے واضح طور پر پیش کیا۔ نئی اصلاحات کو وضع کرنے میں قومی آواز نے نمایاں کردار انجام دیا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے بارے میں بڑی احتیاط برتی، زیادہ تر اصطلاحات خود وضع کیں۔ اس کے علاوہ عربی اور فارسی کی اصطلاحات کو اردو میں استعمال کرنے کے لئے اصول و ضوابط بنائے۔ اردو کا رشتہ عربی اور فارسی سے قطع کرنے کی دانستہ کوشش میں قومی آواز نے اردو کا املا بھی تبدیل کر ڈالا۔ مثال کے طور پر الف مقصورہ ختم کر دیا گیا۔ اعلیٰ کی جگہ اعلا لکھا گیا۔ اضافتوں کو ختم کیا گیا اقوام متحدہ کی جگہ متحدہ اقوام لکھا گیا۔ یہاں تک کہ غنڈہ کو گنڈہ بنا ڈالا گیا لیکن یہ نیا املا زیادہ رائج نہیں ہو پایا۔

قومی آواز نے ہی ہر ہفتہ میگزین پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس ہفتہ وار میگزین میں ادب، شعر و شاعری، بچوں کا گوشہ، فلم ریویو، دنیا کا حال، کتابوں کی باتیں وغیرہ شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ ادبی سرگرمیاں شاعروں کی تفصیل شائع ہوئی۔ اس ہفتہ وار میگزین میں اس دور کے کئی قلم کار کی تخلیق شائع ہونا باعث فخر رہا۔ سلسلہ وار ناولوں، انشائیوں اور آپ بیتی شائع کرنے کا رواج قومی آواز نے ہی شروع کیا۔

عزائم لکھنؤ

جمیل مہدی کی ادارت میں لکھنؤ سے ۱۵؍اگست ۱۹۴۹ء کو ہفتہ وار عزائم شائع ہونا شروع ہوا جو بعد میں ۲۶؍جنوری ۱۹۷۹ء سے روزنامہ ہو گیا۔ اس نے اپنی تحریروں سے ہندوستان کے دوسرے روزناموں میں اپنا منفرد مقام بنالیا اور قومی سطح پر مشہور ہوا۔ اس اخبار نے شروع ہی سے بڑے سلیقے سے حکومت کی پالیسیوں کی نکتہ چینی کی لیکن مخالف سیاسی پارٹیوں کی بھی پذیرائی نہیں کی جو بھی غلط پالیسی چاہے وہ حکومت کی ہو یا مخالف پارٹیوں کی اس نے برجستہ نکتہ چینی کی۔ کبھی کبھی اس کی تحریروں میں شدت آجاتی ہے۔ اقلیتوں اور ان کے مسائل کو پیش کرنے میں اس نے سنجیدہ اور مثبت رویہ اپنایا اور اس سلسلہ میں تمام کے مکتبہ فکر کے لوگوں کے بیان اور خبروں کو اپنے یہاں جگہ دی۔ اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے قلم کے جادو سے ملک بھی کے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ ان کی تحریروں کا انداز نرالا ہے جس سے ان کے دردمند ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

جہاں تک عزائم کی زبان کا تعلق ہے تو اس میں لکھنؤ کا رنگ صاف طور پر جھلکتا ہے۔ چونکہ یہ اخبار مسلمانوں کے دانشور طبقہ کی ترجمانی کرتا ہے اس لئے اس نے زبان کی سجاوٹ اور آرائش سے پرہیز نہیں کیا۔ جمیل مہدی نے اپنے اداریوں میں بامحاورہ زبان استعمال کی۔ ان کی زبان، علمی کم اور ادبی زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کے ایک مخصوص طبقے کا بھی پسندیدہ اخبار تھا۔

انقلاب (ممبئی)

ممبئی سے شائع ہونے والے 'انقلاب' کا شمار ہندوستان کے بڑے روزناموں میں ہوتا ہے۔ انقلاب کو کئی معنوں میں اردو کے دوسرے اخباروں سے ممتاز ہے۔ اس کا معیار کسی بھی زبان کے اخبار سے کم نہیں اور نئے دور

کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اردو اخبار کی عام روایت سے ہٹ کر گیٹ اپ پر خصوصی توجہ دی۔ رپورٹنگ بھی دوسرے اخباروں سے بہتر ہے۔ آزادانہ رپورٹنگ کا معقول انتظام رکھا ہے۔ ایڈٹ صفحہ میں ہفتے کے ساتوں دن موضوع پہلے سے طے رہتے ہیں جن میں اپنے میدان کے ماہر افراد کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ صحت، طب، سائنس، ٹکنالوجی، سیاست اور اقتصادیات کے موضوع پر تازہ ترین اطلاعات پر مبنی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلم، ادب، کتابوں پر تبصرے اور مستقل مزاحیہ کالم شائع ہوتے ہیں۔

انقلاب میں زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانے کی کوشش کی گئی اور سہل نگاری سے اس طرح کا کام لیا جاتا ہے کہ عام قاری بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ دراصل انقلاب ان لوگوں کا اخبار ہے جو شمالی ہند کے مختلف حصوں سے روزی روٹی کی تلاش میں ممبئی میں مقیم ہیں۔ انقلاب کی زبان کا اسلوب دوسرے اخبارات سے اسی لئے مختلف ہے۔ موقع اور محل کے لحاظ سے الفاظ کے استعمال میں مختلف تجربہ بھی کئے ہیں۔ لیکن اس بات کی کوشش کی گئی کہ مراٹھی الفاظ شامل نہ ہو پائیں جس سے اس کی زبان تبدیل نہ ہو پائے۔ انقلاب میں جابہ جا ہندی کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں لیکن کوشش یہی کیا جاتی ہے کہ اردو کے ڈھانچے پر آنچ نہ آنے پائے۔ اسی لئے اس نے زبان کے سلسلے میں زیادہ تجربے نہیں کئے۔ ہاں ممبئی کی بولی میں جو الفاظ رچ بس گئے ہیں اور لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے وہ ضرور شامل کئے جاتے ہیں۔ انقلاب کو ایک معیاری اخبار کہا جاسکتا ہے جس نے جدید صحافت کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی رہا ہے۔

سیاست (حیدر آباد)

حیدر آباد سے رہنمائے دکن اور منصف دو بڑے روایتی طرز کے اخبار ہیں لیکن سیاست کو جنوبی ہندوستان کا اردو کا نمائندہ اخبار کہا جاسکتا ہے۔ اس نے متوازن صحافت کا آغاز کیا۔ خبروں کے علاوہ جدید علوم، فلم اور دوسرے فنون کی نمائندگی کی۔ اس اخبار کی کامیابی کا سہرا عابد علی خاں کی سیاسی بصیرت کے سر ہے جن کی تحریروں نے حیدر آباد کے باشندوں کے دل میں جگہ بنالی۔ رپورٹنگ کے معاملے میں اس نے دوٹوک رویہ اپنایا جو اس کی مقبولیت کا اصل سبب ہے۔

حیدر آباد سے چونکہ عربوں کا گہرا تعلق رہا ہے اور اس سے ایک نئے قسم کا جدید اسلامی کلچر پیدا ہوا جس سے مقامی اردو زبان عربی آمیز ہو گئی ہے۔ شمالی ہند میں تو قومی آواز نے دانستہ طور پر اردو سے عربی کا رشتہ منقطع کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے برعکس سیاست نے عربی آمیز اردو کو اپنایا۔ ویسے بھی شمالی ہند کی اردو جنوبی ہند کی اردو سے مختلف رہی ہے۔ ولی دکنی سے لیکر مخدوم محی الدین تک کی زبان میں نمایاں فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ حیدر آباد کے اخباروں کی اردو میں عربی کے اثرات کو نمایاں طور پر مل جائیں گے لیکن تمل اور تیلگو کے الفاظ نہیں ملیں گے۔ صحافتی زبان کے اصول کے تحت تمل اور تیلگو الفاظ کی کثرت ہونی چاہئے تھی لیکن ایسا نہیں ہے۔ زبان کے معاملے میں سیاست نے بہت احتیاط برتی اور قومی آواز کی تقلید نہیں کی۔ اس نے حیدر آباد کے کلچر اور تہذیب کو جدید رنگ و آہنگ میں اس طرح پیش کیا کہ حیدر آباد ہی جدید صحافت کا ترجمان بن گیا اور اسی خصوصیت کی بنا پر حیدر آباد کا یہ سب سے زیادہ مقبول اخبار بن گیا۔

آزاد ہند (کلکتہ)

آزاد ہند آج مغربی بنگال کا سب سے مقبول اخبار ہے۔ ۱۹۳۰ء میں سب سے ابوالکلام آزاد کے دست راست اور معاون مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ہفتہ وار "ہند" نام سے اسے شروع کیا۔ بعد میں "الہند" ہوا پھر اس کا نام "جدید ہند" پھر "ہند روزانہ" اور "روزانہ ہند" سے ہوتا ہوا "آزاد ہند" ہو گیا۔ ابتدا میں اس اخبار کا رجحان بائیں بازو کی طرف تھا پھر کانگریس کی طرف مائل ہوا پھر ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے مفادات کا حامی ہو گیا۔

دراصل آزاد ہند انقلاب کی طرح ہجرت کرنے والوں کا ہی اخبار ہے۔ جو اتر پردیش، بہار اور کشمیر سے روزگار کی تلاش میں بنگال پہونچے ہیں۔ ایک طرح سے اس کا شمار بھی مسلمانوں کے ترجمان کا ہے اس میں زیادہ تر خبریں وہی رہتی ہیں جن کا تعلق مسلمانوں سے ہوتا ہے۔

آزاد ہند کی زبان معیاری اردو ہے۔ بنگال سے شائع ہونے کے باوجود اس نے بنگالی کے اثر سے اپنے آپ کو پاک رکھا۔ ہاں بنگال کے روزمرہ کے استعمال ہونے والے الفاظ کہیں کہیں ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ پہلی نظر میں دیکھنے پر یہ نہیں لگتا کہ آزاد ہند بنگال سے شائع ہونے والا اخبار ہے۔ زبان کے معاملے میں اس نے کوئی نیا تجربہ نہیں کیا۔ عام طور پر متوازن اخبار ہے لیکن اکثر جوش وولولہ بھی دکھائی دیتا ہے جو آزاد ہند کی مقبولیت کی اصل وجہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی زبان معیاری اردو ہے جس سے کلکتہ میں رہنے والے غیر بنگالی عوام میں بہت مقبول ہوا کیونکہ ان لوگوں کو اس اخبار میں اپنے وطن کی خوشبو ملتی ہے۔ آزاد ہند میں ہر اتوار کو ہفتہ وار میگزین 'اجالا' شائع ہوتی جس میں مذہب، ادب، سیاست اور فلم کے علاوہ بچوں کی دلچسپی کے مضمون شائع ہوتے ہیں۔ چونکہ اس کے مالک کا تعلق ملیح آباد سے ہے اس لئے اس کی زبان میں لکھنؤ کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

ملاپ (دہلی)

آریہ سماج سے تعلق رکھنے والے مہاشے خوشحال چند نے اسے لاہور سے ۱۹۲۳ء سے شروع کیا۔ بعد میں یہ حیدر آباد دکن اور پھر دہلی سے شائع ہونے لگا۔ ایک مشن کے تحت شروع ہونے والے اس اخبار کی رسم الخط اگرچہ اردو ہے لیکن زبان کے اعتبار سے ہندی اور پنجابی ہی کہا جائے گا۔ اس میں استعمال ہونے والی زیادہ تر تراکیب اور اصطلاحیں ہندی، پنجابی اور سندھی کی ہیں اس اخبار کے بیشتر قارئین وہی ہیں جو آزادی کے قبل اردو ماحول میں پلے بڑھے۔ ملاپ کی زبان پر نہ تو اردو کا اثر ہے اور نہ ہی اس میں اردو کی سلاست اور روانی ہے۔ ہندی الفاظ اس سے دھڑلے سے شامل کئے جاتے ہیں۔ جس طرح خبریں اور پریس نوٹ ہندی میں آتی ہیں انہیں اسی طرح اردو میں لکھ دیا جاتا ہے۔

ملاپ ان معنوں میں منفرد اخبار ہے کہ اس کے صفحہ اول پر خبریں نہیں ہوتی ہیں بلکہ فیچر تصاویر اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔ خبریں صفحہ ۳ پر چھپتی ہیں۔ ان مضامین کی نثر خبروں کے برعکس عام فہم اور نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔ ملاپ میں "پیاز کے چھلکے" کا کالم بہت مشہور ہوا جس نے اردو صحافت میں نہیں اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔ اخبار کی مقبولیت میں اس کالم کا بہت ہاتھ ہے۔ اس کے کالم نویس فکر تونسوی کو اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں خاص مقام حاصل ہے اور انہیں صف اول کے طنز نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد کے اخبارات نے اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے روایتی انداز کو اپناتے ہوئے جدید لب و لہجہ اپنایا اور زبان و بیان کو نکھارا۔ اس دوران نئے نئے تجربات کے ساتھ اردو صحافت کے لب و لہجے کو بہتر کیا۔ ممبئی کے روزنامہ انقلاب اور اردو ٹائمس، حیدر آباد کے سیاست، دکن اور منصف بنگلور کے سالار نے مکمل اخبار پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ کانپور کا سیاست جدید وہ واحد اخبار ہے جس نے آٹھ آٹھ منزلہ سرخیاں لگائیں

اور پوری خبر سرخیوں میں ہی دینے کی کوشش کی۔ ان تمام اخبارات میں ادب کے لب و لہجہ تراکیب و محاورے، الفاظ کی سخات اور جملوں کی بناوٹ میں تحریر کے دور اور علاقے کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ زبان کی فطری ارتقا کی سی جلوہ گری ہے۔

معیاری صحافت نے ہر دور میں ایسی زبان اور اسلوب کو اپنایا جس کو قاری آسانی سے سمجھ لے۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی بول چال کے الفاظ صحافت میں شامل ہوتے گئے اور قارئین کے دل میں جگہ بناتے گئے۔ پھر جب قبول عام کی سند حاصل ہو گئی تو ادب نے بھی اپنے پرانے دروازے کھول دیئے۔ اب جبکہ دنیا کے ہر حادثہ اور واقعہ کی خبر سب سے پہلے دینے کی ہوڑ سی لگ گئی ہے ایسے میں زبان و بیان کے لہجے بھی بدل گئے ہیں۔ اسی صورت میں ایسا اسلوب جسے صحافتی اسلوب کہا جا سکے اس کے معیار متعین نہیں کئے جا سکے۔ دراصل یہ ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ زبان کے فطری تقاضے کے یہ برخلاف تھا۔ اس لئے صحافتی زبان کے نت نئے اسلوب فطری عمل کے تحت گڑھے جاتے ہیں یا اپنے آپ وضع ہو جاتے ہیں۔

باب ششم

خاتمۂ کلام

اردو نثر کے صحت مند و توانا اسالیب کے فروغ میں اردو صحافت کا کردار

اردو میں صحافت کے آغاز سے پہلے اردو نثر ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر نے کچھ بال و پر نکالے تھے۔ اس سے پہلے دکن میں کچھ کتابیں لکھی گئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ کے خانوادے کے بزرگوں نے قرآن مجید کے تراجم کے ذریعہ ایک سادہ و سلیس اردو نثر کے خدوخال نمایاں کئے تھے مگر ابھی آہنگ کی ناہمواری اور ہر طرح خیالات کی ادائیگی کی اہلیت سے محرومی کے سبب اردو نثر کا وقار قائم نہیں ہو سکا تھا۔ شاعری اور خطابت دونوں نثر کی گردن پر سوار تھیں بقول ڈاکٹر مسکین علی حجازی :

"اردو نثر کہیں شاعری سے قدم ملاتی نظر آتی تو کہیں خطابت کے قریب پہنچ جاتی۔" (۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس عہد کی نثر کے بارے میں بڑی پتے کی بات لکھی ہے :

"سب رس اور نو طرز مرصع کی زبان الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ کاغذی گھوڑے یا زیادہ سے زیادہ کاٹھ کے گھوڑے رینگتے نظر آتے ہیں۔ ہاں فرق یہ ہے کہ ان پر ریشمی زین پڑے ہوئے ہیں جو نظر فریب اور زرق برق ہیں مگر ان زین پوشوں کے نیچے جو گھوڑے ہیں ترصیع کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں اور بعض اوقات تو ان پر اتنا بوجھ ہے کہ چلانے سے بھی نہیں چلتے جامد اور ساکت رہتے ہیں۔" (۲)

فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں بقول ڈاکٹر مسکین حجازی کسی کتاب میں بھی اس زمانہ کی زندگی کا عکس نہیں ملتا اور یہ زبان زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق علوم و مسائل، انسان کے گوناگوں تجربات و مشاہدات کے اظہار کا ذریعہ بننے کی اہل نہیں۔ باغ و بہار اور طوطا کہانی میں سادگی سلاست و روانی تو ضرور تھی مگر واقعیت سے

(۱) پاکستان و ہند میں مسلم صحافت، مسکین حجازی۔ ص ۸۵

(۲) میرامن سے عبدالحق تک۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مجلس ترقی اردو لاہور، مئی ۱۹۶۵ء ص ۲

قریب نہ تھیں۔ سرکاری زبان فارسی تھی اس لئے پہلے فارسی میں صحافت کی شعاعیں پھوٹیں۔ منشی سدا سکھ لال نے جام جہاں نما اردو میں نکال تو دیا لیکن شکوہ سنج تھے کہ

"لوگ اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے اور اردو جنہوں کی زبان ہے وہ فارسی تحریر چاہتے ہیں۔"(۱)

سدا سکھ لال نے اپنے اسلوب کی فورٹ ولیم کالج کے نامور منشی صاحبان کے طرز پر بنیاد رکھی۔ اس پر عربی و فارسی کے الفاظ کی بھرمار نہیں۔ جملوں کی ساخت اگرچہ ناہموار ہے مگر ادائیگی میں بے تکلفی ہے۔ منشی جی کی زبان، انفرادی و اجتماعی تجربات کی ترجمانی کرنے کی بخوبی اہل ہے۔ مثلاً ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو :

"ان سبھوں نے موافق دستور کے سلامی کی۔ ریزیڈنٹ صاحب کوٹھی سے نکل کر حضرت کو اندر لے گئے۔ حاضری کھلائی۔ خلوت میں کچھ باتیں ہوئیں۔ معتبر الدولہ بھی حاضر تھے۔ حضرت عالی نے بلدی مالی کو جس نے فصلی میوے کی ڈالی گزاری تھی پانچ روپے انعام دیئے۔ وہاں سے رخصت ہوئے۔ محلسرا میں داخل ہوئے۔ صاحب عالم بہادر سے فرمایا کہ یہاں حاضر رہو۔ خود بدولت چار گھوڑے کی گاڑی میں سوار ہو حسن باغ کو گئے وہ مکان صاحب عالم بہادر کے رہنے کے واسطے آراستہ ہوا تھا ملاحظہ فرمایا............"(۲)

مگر کلکتہ کا اثر پورے ملک پر نہ پڑ سکا اور عوامی سطح پر فارسی مقبول اور اس کا اسلوب محمود رہا۔ یہاں تک کہ بمبئی سے جاری ہونے والے پہلے اردو اخبار "کشف الاخبار" کی زبان فورٹ ولیم کالج کے دبستان یا جام جہاں نما کی

---

(۱) جام جہاں نما ۲۳/ جنوری ۱۸۲۸ء

(۲) جام جہاں نما ۱۲/ اکتوبر ۱۸۲۵ء

زبان سے قطعاً مختلف ہے اور اس پر عربی و فارسی کے اسلوب اور لغات کا غلبہ ہے۔ مثال کے طور پر چند سطور ملاحظہ ہوں :

"حمد و سپاس بے نہایت ثنا و ستائش بے غایب اس جناب احدیت قادر کریم خالق و رازق و رحیم کو سزاوار ہے جو اپنے بندوں کے ہر کام کے لئے مسبب الاسباب رہبر و مددگار ہے۔"(۱)

پھر مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں دہلی اردو اخبار جاری کیا اور سرسید کے بھائی سید احمد خاں، سید الاخبار لے کر منظر عام پر آئے۔ دہلی سے ایک اور اخبار "صادق الاخبار" جلوہ گر ہوا۔ لاہور سے بھی ۱۸۵۷ء سے پہلے "کوہ نور" اور دیگر اخبارات سامنے آئے۔ لیکن بقول ڈاکٹر مسکین حجازی دلی، آگرہ، لکھنؤ، مدراس، بنارس اور پنجاب سے جو اردو اخبارات شائع ہوئے ان کی زبان کے اسالیب میں وہی فرق ملتا ہے جو ان تینوں مقامات کے ادیبوں اور شاعروں کی زبان میں موجود تھا......"(۲)

بالعموم تھوڑے بہت فرق سے ہر مقام سے جاری ہونے والے اخبارات فارسی و عربی سے بوجھل ہوتے تھے۔ ان کے ناموں کی ترکیب بھی عربی تھی مثلاً سراج الاخبار، سید الاخبار، صادق الاخبار، اسد الاخبار، معیار الشعرا، قطب الاخبار، مفتاح الاخبار، اخبار الحدائق، مفید الخلائق، قرات السعدین وغیرہ۔ ان اخبار کے جملوں سے افعال ضمائر و اسماء آپ الگ کر دیں تو عربی یا فارسی عبارت محسوس ہوگی مثلاً صادق الاخبار کے دو جملے ملاحظہ ہوں :

"اخلاق ناصری ایک کتاب ہے حاوی فوائد بے حساب اور ایک نسخہ ہے محتوی منافع بے شمار، ہرچند عوام کالانام اپنی کور سوادی سے نہیں سمجھتے مگر والا نظران بلند نشین اسکی قدر کو پہچانتے ہیں۔" (۳)

---

(۱) بحوالہ رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۴۵ء ممبئی کی صحافت رئیس احمد جعفری ص ۳۷۸

(۲) پاکستان و ہند میں مسلم صحافت، مسکین حجازی ص ۸۶ (۳) صادق الاخبار، ۲۳/مارچ ۱۸۵۷ء

لکھنؤ میں بھی یہی رنگ چھایا ہے۔ لکھنؤ اخبار، طلسم لکھنؤ، سحر سامری، مخزن الاخبار سب پر لکھنؤ کا خاص مزاج اور لسانی جاہ و حشمت اور تکلف و تصنع کا غلبہ ہے۔ عبارت مسجع و مقفیٰ ہیں۔ حتیٰ کہ خبریں اور اعلانات بھی منظوم و مقفیٰ ہیں۔ اگرچہ دہلی کے مقابلہ میں عربی و فارسی الفاظ کا استعمال کچھ کم ہوتا ہے۔ سحر سامری کا ایک نمونہ دیکھئے :

"ان دنوں غلہ کی گرانی ہے۔ گرانی خاطر کی ارزانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہے آسیائے فلک بھی دانے کی محتاج ہے۔ فاقہ کشوں کی برق آہ شرربار سے خرمت ماہ جل گیا۔ گروہ نان خورشید لشکر غم کے پاؤں کے نیچے کچل گیا۔" (۱)

پنجاب سے جو اردو اخبارات ۱۸۵۷ء سے قبل منظر عام پر آئے ان کے اسالیب کے بارے میں ڈاکٹر حجازی کی اس رائے سے ہم متفق ہیں کہ :

"چونکہ اس علاقہ میں اردو صحافت کو متعین لسانی اسالیب کا ورثہ نہیں ملا تھا اور اخبارات شروع ہی مشاہدات و تجربات کے اظہار و بیان اور واقعیت کی تصویر کشی کے لئے ہوتے تھے اس لئے ان کا لسانی اسلوب شروع ہی سے مختلف تھا۔ زبان نسبتاً آسان اور سادہ ہے اگرچہ عربی و فارسی کا اثر موجود ہے مگر اتنا نہیں جتنا دلی کے اخبارات پر تھا۔ لکھنوی اخبارات کے برعکس زبان مسجع و مقفیٰ نہیں بلکہ سیدھا و سادہ انداز ہے۔ بیان میں بے تکلفی و بے ساختگی ہے۔ جملوں کی ساخت بھی قدرے آسان ہے اور زبان میں ایجاز و اختصار ہے۔" (۲)

---

(۱) سحر سامری، نومبر ۱۸۵۶ء

(۲) پاکستان و ہند میں مسلم صحافت، حجازی ص ۸۸

اس بیان کی تائید میں پنجاب کے کوہ نور کی یہ عبارت ملاحظہ ہو :

"اودھ کے لوگ ضبطی ملک سے ناخوش ہیں۔ ہزارہا امیدواران نوکری شور و غل مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سرکار کو سوائے ملک اودھ کے غیر مقامات کے آدمیوں کو نوکر رکھنا بعید از انصاف ہے۔ بادشاہ کے قدیمی ملازمین بجز چند آدمیوں کے سب برخاست ہوگئے ......" (۱)

پہلی جنگ آزادی کے بعد سر سید اور ان کی تحریک علیگڑھ نے ایک انقلاب برپا کر دیا اور ۱۸۵۷ء سے پہلے کا اسلوب موقوف ہوا۔ پرانی روش ترک کر کے لوگ نئی روشنی اور نئے خیالات کا ساتھ دینے اور نئے تقاضوں کو سمجھنے پر مجبور ہوئے۔ اب اردو ادب کے رنگ محل سے باہر آنے پر مجبور ہوئی۔ فضول لاحاصل اور بے مقصد مشاغل سے اردو کو چھٹکارا دلانے کا کارنامہ سر سید نے انجام دیا۔ اردو صحافت پر تو ان کا خاص احسان ہے کہ اسے انہوں نے بنا سنوار کر نئے دور سے آنکھیں چار کرنے کے لائق بنایا۔ انہوں نے خود اپنی لسانی پالیسی اور اسلوب کے خدوخال خود اپنے الفاظ میں اجاگر کئے ہیں :

"جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری کی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور مضامین خیالی سے بھری ہوتی ہے اور اس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں

---

(۱) کوہ نور، ۲۶ر فروری ۱۸۵۶ء

ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے کہ وہ اس زمانہ میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔
جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہے وہ
صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے
تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے......" (۱)

سر سید نے صحافت میں علم و فکر کی روح ڈالی۔ علیگڑھ تحریک بنیادی طور پر اصلاحی تحریک تھی۔ اس لئے ایک مصلح اور خیر خواہ قوم کی زبان انہوں نے اختیار کی جیسے کوئی سونے والوں کو جگا رہا ہو۔ سر سید چونکہ مغرب کے علوم و فنون اور ترقیات کا راز جانتے تھے اس لئے انہوں نے مغرب کی طرح عقل و دلیل کو راہنما بنایا۔ ان کے اسلوب صحافت پر معقولیت غالب ہے۔ گویا اب صحافت نے داستان اور کہانی کا انداز ترک کر کے منطق و استدلال کا دامن تھام لیا۔ بقول ڈاکٹر م۔ حجازی :

"واقعات و معاملات پر ایسی بے لاگ رائے ہوتی ہے جس سے عاقبت بینی
وسعت معلومات اور تعمیری نقطۂ نظر جھلکتا ہے۔" (۲)

سر سید کے ہاتھوں اردو صحافت تہذیب و تمدن کو صحت مند رخ عطا کرنے کا ایک وسیلہ بن گئی۔ اس کا تعلق تخیل اور رومانیت کی دنیا کے بجائے انسان کے مادی پہلوؤں اور گردو پیش کے حالات کو سازگار بنانے والے عناصر سے قائم ہو گیا۔ تہذیب الاخلاق محض ایک اخبار نہیں تھا بلکہ ایک ادارہ تھا اور سر سید کو محسن الملک وقار الملک چراغ علی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، شبلی اور حالی جیسے معاونین مل گئے۔ ان سب نے اردو صحافت کو نیا رنگ و روغن عطا کیا اور یہ سب اُس مہم کو کامیاب بنانے میں شریک رہے جسے سر سید نے شروع کیا تھا۔ ان سب اہل قلم

(۱) تہذیب الاخلاق، سال ۱۲۹۱ھ

(۲) پاکستان و ہند میں مسلم صحافت ص ۸۹

کا طرز تحریر جدا جدا ہے لیکن سب کے یہاں مشترک عنصر سادگی متانت، جامعیت اور استدلال کا پایا جاتا ہے۔ یہ سب حضرات ایک مشن رکھتے تھے اور واضح طور پر اپنے خیالات لوگوں تک ایک بلند مقصد کے پیش نظر پہنچانا چاہتے تھے۔ ادب یا صحافت ان کے لئے ذہنی عیاشی کا ذریعہ نہ تھی۔ وہ صحافت میں شاعری کرنے کے قائل نہ تھے اس لئے کہ اس طرح وہ دنیا جہان کے علوم کو اردو کے ذریعہ لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ مبالغہ آرائی، ہنسی ٹھٹھا، بے جا طنز، ذاتی حملے اور پھکڑپن اختیار کرتے تو پھر وہ کوئی ذہنی انقلاب کس طرح برپا کر دیتے۔ متانت کو انہوں نے مشعل راہ بنایا اور غور و فکر کی عادت ڈالنے کی تلقین کی۔ قدیم انداز نگارش اور اسلوب تحریر سے دامن کش ہو کر انہوں نے آزادی اظہار اور آزادی فکر کی روش عام کی۔ انگریزی الفاظ سے قوم کو مانوس بنایا۔ اردو صحافت ان بزرگوں کی بدولت مادّیت، عقلیت، اجماعیت اور حقائق نگاری سے آشنا ہوئی۔ رشید احمد صدیقی نے سچ فرمایا ہے :

> "سر سید اور ان کے رفقائے کرام نے اردو ادب کے بیشتر موضوعات پر جو تصانیف پیش کی ہیں ان کو مختلف اسالیب کے اعتبار سے بنیادی یا معیاری قرار دے سکتے ہیں۔ اس لئے ان کے بعد آنے والوں نے جہاں کہیں ان موضوعات کو اختیار کیا مثلاً مذہب، کلام، سیرت، تنقید، سیاست، انشائیے وغیرہ ان کا اسلوب تحریر کم و بیش ان بزرگوں کے اسلوب نگارش سے جاملا ہے۔" (۱)

بیسویں صدی کے نصف آخر میں سر سید اور ان کے دبستان کے علاوہ اردو صحافت کی اسلوب کے اعتبار سے اہم خدمت لکھنؤ کے اودھ پنچ نے انجام دیں۔ لطف یہ ہے کہ اودھ پنچ اگرچہ سر سید کا فکری اعتبار سے مخالف

---

(۱) تنقیدی مقالات۔ مرتبہ مرزا ادیب۔ لاہور اکیڈمی لاہور ۱۹۶۵ء ص ۸۹

تھا اور اس سنجیدگی و متانت کے بجائے فکاہیہ انداز اپنایا تھا لیکن اس کے مصنفین کا اسلوب اور طرز نگارش بھی سر سید تحریک سے متاثر ہے۔ چکبست کے الفاظ میں :

> ”اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اتار کر جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے کچھ نہ تھا ایسے پھولوں سے آرستہ کیا جن میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا۔ اودھ پنچ سے پہلے رجب علی بیگ کے طرز تحریر کی پرستش ہوتی تھی اور عام مذاق تصنع اور بناوٹ کی طرف مائل تھا۔ اس زمانہ میں جو اردو اخبارات جاری تھے ان کی زبان ایسی ہوتی تھی جسے ہم محض محبت سے اردو کہہ سکتے ہیں۔ آج نثری اردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بڑا حصہ ہے۔“ (۱)

اودھ پنچ کے قلمی معاونین کی جماعت بھی سر سید کے احباب کی طرح بے حد چاق و چوبند تھی خواہ مقاصد اتنے اعلیٰ وارفع نہ ہوں لیکن ان کی زبان و اسلوب کی خدمات کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی شوق، تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، جوالا پرشاد برق، احمد علی کسمنڈوی اور اکبر الہ آبادی سب زبان و قلم کے میدان کے شہسوار ہیں۔ شوخی تازگی اور غیر معمولی بے تکلفی سے ان کی تحریریں بھرپور ہیں۔ ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں کے طرز بیان میں یکسانیت نہیں مگر سب کے یہاں جو چیز مشترک ہے وہ سادگی سلاست، بے تکلفی اور محاورے کا چٹخارہ ہے۔ یہ سب حضرات بھی سر سید کے احباب کی طرح انگریزی کے الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ سنجیدگی اور زیر لب تبسم کی جگہ قہقہے

---

(۱) مضامین چکبست۔ چکبست لکھنوی

کی پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں۔ پھبتی کسنے کا شوق سب کو ہے۔اس کی وجہ سے اس حلقہ کی صحافیانہ تحریروں کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کی گئی ہے۔وزیر آغا کے الفاظ میں :

"اودھ پنچ کی ظرافت ادبی عناصر سے بھی حد تک تہی اور سستے قسم کی ہزل اور پھکڑ پن سے زیادہ قریب ہے۔" (۱)

اردو صحافت میں اودھ پنچ کا یہ رنگ کچھ دن تک چلتا رہا مگر بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اس سے لوگ دامن کش ہو گئے اور اردو صحافت کئی قدم آگے نکل گئی۔اس عہد میں پنجاب سے بے شمار اخبارات شائع ہوئے اور ان کے ذریعہ اردو صحافت نے کئی دشوار گزار مراحل طے کئے۔کوہ نور اور پیسہ اخبار نے صحافت کے رنگ کو نکھارااور اسے صاف اور چمکدار بنایا۔اس عرصہ میں پنجاب کے مختلف علاقوں سے سوادوسو کے قریب اخبارات منظر عام پر آئے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی۔کاشتکاری، باغبانی، طب، سیاست اور مذہبی مناظروں کے الگ الگ شعبوں میں اپنا جوہر دکھایا۔ مذہبی مناظرات میں تو بیشتر اخبارات الجھے نظر آتے ہیں اور ان کا اسلوب نہایت کڑوا کسیلا ہو جاتا ہے۔

سرسید کے بعد بیسویں صدی میں ظفر علی خاں، مولانا آزاد، محمد علی جوہر کا عہد آتا ہے۔سیاسی بیداری پھیلتی ہے۔ عوام کا اخبارات سے تعلق مستحکم ہوتا ہے۔سیاسی ہماہمی کی وجہ سے ادبی وصحافتی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مطلع صحافت پر صلائے عام، ریاض الاخبار، اردوئے معلیٰ اور مخزن جیسے جرائد نمودار ہوتے ہیں۔ان میں اکثر کی زبان ادب کے سانچے میں ڈھلی ہوئے ہیں۔نثر پر شاعری کا اثر ہے۔کلاسیکی اور جدید دونوں رجحانات شانہ بشانہ پائے جاتے ہیں۔سرسید کی حقیقت وواقعیت، سادگی اور عقلیت سے رومانیت کی طرف میلان

---

(۱) اردوادب میں طنزومزاح۔ وزیر آغا ص ۱۴۹

ہونے لگتا ہے۔ مخزن کے اہل قلم کے یہاں ٹیگور اور آسکر وائلڈ کی سرور آفریں دھندھ پھیلی جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر مسکین حجازی :

> "اسی زمانہ میں اردو صحافت ایک ایسے مرحلہ میں پہنچ گئی کہ ادبی صحافت اور صحافتی ادب میں فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ صحافیوں کا ایک گروہ جو بنیادی طور پر ادیب ہے اور رسائل و جرائد میں کام کرتا ہے صحافت کو ادبی سطح پر لے جانا چاہتا ہے۔ صلائے عام، ریاض الاخبار اور خواجہ حسن نظامی کے اخبارات اسی ذیل میں آتے ہیں۔ دوسرا گروہ صحافی پہلے تھا اور ادیب بعد میں۔ وہ سیاسی اور معاشرتی مقاصد کے لئے صحافت کو اپناتا ہے۔ ایک گروہ اسلوب کو نکھارنے سنوارنے اور اسے ادبی فضا سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک صحافت ادب کی اشاعت کا بیش قیمت ذریعہ ہے۔ دوسرے گروہ کے ہاں اسلوب کی جدت ضرور ہے مگر اس کے ہاں صحافت کی عام اور سادہ روش ملتی ہے......" (۱)

ظفر علی، محمد علی جوہر اور ابوالکلام نے صحافت کی رگوں میں خون حیات دوڑا دیا۔ اب صحافت جنگ آزادی کا ہراول دستہ بن گئی۔ جوش ولولہ، ہنگامہ اور جذباتیت صحافت کے اجزائے ترکیبی بن گئے۔ استدلال سے زیادہ خطابت کا پہلو صحافیانہ اسلوب کا جز بن گیا۔ اس دور کے مدیران جرائد و اخبارات محض صحافی نہیں بلکہ عالم، خطیب، رہنما اور جنگ آزادی کے سورما بھی تھے۔ لطف یہ ہے کہ اس عہد کے ادب میں رومانیت چھائی ہے مگر صحافت نعرۂ انقلاب اور رجز خوانی کا رنگ اختیار کر چکی ہے۔ پرجوش اور چونکا دینے والا انداز۔ مولانا آزاد کا

---

(۱) پاکستان و ہند میں مسلم صحافت۔ ص ۹۱

"الہلال" جذباتی صحیفہ نگاری کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ مولانا محمد علی کے یہاں عربی و فارسی کے الفاظ کی کثرت نہیں مگر جوش وولولہ ان کی تحریروں میں بھی موجود ہے۔ ظفر علی نے اس عہد میں اردو صحافت کی سب سے زیادہ خدمات انجام دیں بلکہ بقول ڈاکٹر حجازی ان کو بابائے صحافت کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے بڑی تعداد میں اپنے اخبار زمیندار کے ذریعہ صحافیوں کی تربیت کی۔ ان کے یہاں بھی گھن گرج، بے خوفی اور بے باکی پائی جاتی ہے۔ جرأت گویائی کی طوفان خیز لہریں اٹھتی نظر آتی ہیں۔ وہ بھی سرسید کی عقلیت کے بجائے جذباتیت کے قائل ہیں۔ اس عہد کے عام مزاج کے مطابق پرشوکت الفاظ، بلند آہنگ ترکیبیں، پرجوش لہجہ ہر ہر سطر میں پایا جاتا ہے۔ عربی و فارسی کے گرجدار الفاظ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ مشکل الفاظ و تراکیب سے ان حضرات کو عشق ہے۔ مثلاً وحوش وطیور، ظلمت کدۂ فرنگ، ببانگِ دہل، آتش صاعقہ، برق استبداد، ربع مسکون وغیرہ۔ محاورات کی کثرت ہے اور الفاظ کے تانے بانے سے مرعوب کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اسی عہد میں شبلی و محمد حسین آزاد کا گویا طوطی بولتا ہے۔ سرسید و حالی ایک گوشہ میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ظفر علی خاں کا حلقہ اثر کافی پھیل گیا تھا اور ابوالکلام کا جادو ہر شخص پر سوار تھا اس لئے جسے دیکھئے اسی رنگ صحافت اور انداز نگارش کا قتیل تھا اور ایک عرصہ تک یہی لب و لہجہ اردو صحافت میں مقبول عام رہا۔

لیکن اب اردو صحافت امراء، علماء اور دانش وروں کی محفلوں تک محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ انقلاب کی لہریں گاؤں گاؤں، قریہ قریہ تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے اثرات صحافت کے اسلوب اور لب و لہجہ پر پڑنے ناگزیر تھے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک اردو نثر کے اسلوب میں چار واضح روایتیں نظر آتی ہیں۔

ایک روایت کا حامل تو وہ دینی ادب ہے جسے روایتی علما تیار کر رہے تھے۔ اس میں زبان کی صحت کا تو لحاظ تھا مگر اسلوب بے حد پھیکا اور بے جان تھا۔ مناظراتی ادب میں البتہ فصاحت، بلاغت، طنز ادبی چوٹیں وغیرہ پائی جاتی

تھیں مگر اس کی دنیا محدود تھی۔ دوسری روایت کے بانی سر سید تھے۔ اس میں نثر صاف ستھری سادہ و پر وقار تھی لیکن کر ختگی اور اکھڑ پن بھی موجود تھا۔ ایک تیسری روایت کے علمبر دار شبلی تھے۔ جنہوں نے انگریزی الفاظ کے بجائے اپنی نثر کو عربی و فارسی ادب کے جاندار اجزا سے توانا بنایا۔ ان کی نگاہ وکٹورین عہد کے بجائے عباسی دور کی ادبی روایات پر مرکوز ہیں۔ سادگی و وضاحت کے ساتھ رنگینی و شیرینی بھی پائی جاتی ہے۔ ایک چوتھی روایت ابوالکلام آزاد نے قائم کی جن کی نثر پر خطابت و رومانیت کا غلبہ ہے اور جو بقول خورشید احمد :

”جذبات سے دلیل کا کام لیتے ہیں اور الفاظ کے سیلاب میں عقل و احساس کو بہا کر لے جاتے ہیں۔ شاید ملت اسلامیہ ہند کا قافلہ جس ہیجانی دور سے گزر رہا تھا اس کے لئے ابوالکلام کی ہنگامہ خیز اور طوفانی نثر موثر تھی......“(۱)

اس صدی کی تیسری دہائی تک آتے آتے غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، ابوالاعلیٰ موجودی اور عبدالماجد دریابادی جیسے صحافی و قلمکار میدان پر آگئے۔ صحافت کی زبان کو آسان عام فہم اور سادہ بنانے کا رجحان بڑھنے لگا۔ اب دوبارہ جوش و جذبہ کے بجائے عقل و استدلال کی پذیرائی ہونے لگی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں :

”سر سید کی صحافتی عقلیت کا اندازہ ہمارے زمانہ میں کسی نے اختیار کیا تو وہ مولانا مہر مدیر انقلاب ہیں۔“

۱۹۳۶ء کے آتے آتے زمانے کے تقاضے کی وجہ سے اردو صحافت نے نیا رنگ و آہنگ اختیار کر لیا۔ ظفر علی خاں اور آزاد کے اثرات سے آزاد ہو گئی۔ زبان اور لب و لہجہ میں غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں نوائے وقت کے منظر عام پر آنے سے حالات میں اور تبدیلی پیدا ہوئی۔ اب ادب و صحافت کے راستے الگ الگ

---

(۱) ادبیات مودودی۔ مرتبہ خورشید احمد۔ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۸۰ء ص ۳۰

ہونے لگے۔ اب صحافت ادب سے متاثر ہونے کے بجائے خود ادب کو متاثر کرنے لگی۔ خود ادب میں صحافت کی زبان اور اسلوب کی سادگی اور سلاست کا نفوذ ہونے لگا۔ اب زبان مقصد اور مدعا نہیں رہی بلکہ ذریعہ بن گئی۔ اب زبان کا صرف یہ مذہب رہ گیا کہ وہ اخبار کے قارئین تک ادارے کے خیالات کو بے کم و کاست پہنچادے۔ اب اخبارات کا حلقہ وسیع ہو گیا۔ کم پڑھے لکھے لوگ بھی اخبار خریدنے اور پڑھنے لگے۔ اس لئے ان کی رعایت بھی ضروری قرار پائی چنانچہ رنگین و پیچیدہ زبان کی گنجائش نہ رہی۔ صرف دلکش پیرایہ اور عام فہم اسلوب میں بات کہنے کو کافی سمجھا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ زبان کی گرامر کے اعتبار سے بھی صحت کو بہت زیادہ ضروری نہیں سمجھا جانے لگا۔ بس غرض و غایت یہ قرار پائی کہ خیالات کو آسان اور کم سے کم الفاظ میں بیان کردیا جائے خواہ زبان کی قواعد کے اصولوں کو کبھی کبھی بالائے طاق کیوں نہ رکھنا پڑے۔ صحافت کے نقطۂ نظر سے اب یہ بات پسندیدہ نہیں رہی کہ اخبار کا قاری خبر یا شذرہ کے نفس مضمون کے بجائے اس کے انداز بیان یا زبان کی دلکشی میں الجھ جائے اور اس کی داد دینے لگے۔ ایجاز و اختصار کو طول کلامی پر ترجیح حاصل ہوگئی۔ اب ؎ "لذید بود حکایت دراز تر گفتن" کے بجائے ذہانت و قابلیت کا یہ تقاضہ قرار پایا کہ اختصار سے بات کہی جائے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو صحافت کو آزمائش کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ آزادی کی جنگ میں جس اردو زبان و صحافت نے ایک انقلاب آفریں رول ادا کیا تھا۔ آزادی کے بعد معتوب ہوگئی۔ اگرچہ یہ ملک کی مشترک زبان اور گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان تھی لیکن تقسیم ملک کے بعد اسے غیر ملکی تصور کیا جانے لگا اور ہندی کے مقابلہ میں اس کے فروغ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جانے لگیں چنانچہ اخبارات دم توڑنے لگے اور اشاعت گھر بند ہونے لگے۔ ایک اندازہ کے مطابق آزادی سے قبل دہلی میں اردو کے ۱۴ روزنامے تھے ان میں گیارہ کے مالک و مدیر مسلمان ہوگئے۔ ان میں سے ۹ اخبارات تو بند ہوگئے۔ باقی اپنی دوکان بڑھا کر پاکستان چلے گئے۔

آزادی کے بعد اردو صحافت تین خانوں میں بٹ گئی۔ اول تو حکمراں جماعت کے دامن عافیت میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور آزادی تحریر و اظہار کو خیر باد کہہ دیا۔ آنکھ بند کر کے سیکولرزم کی حمایت کرنے لگے۔ دوسرا طبقہ اردو بولنے والے عوام کے بنیادی مسائل کو نظر انداز کر کے انہیں فروعی مسائل میں الجھانے اور جذبات کو مشتعل کر کے کاروبار صحافت کو فروغ دینے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لب و لہجہ میں کبھی ماتمی انداز اور کبھی اشتعال انگیز تیور کی جھلک موجود تھی۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے مختلف سیاسی پارٹیوں کے مفاد کے لئے کام کرنا شروع کر دیا اور اشتہاری اور پروپیگنڈہ کا انداز اپنا لیا۔ اس طرح صحافت مال تجارت بن گئی اور اس نے اپنا قائدانہ رول ترک کر دیا۔ اس کا دائرہ سمٹ کر پیشہ ورانہ مفادات تک محدود ہو گیا۔ یہ حصول زر اور سیاسی راہنماؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ لیکن اس ہجوم میں اب بھی کچھ غیرت مند اور خوددار اصحاب قلم موجود تھے جنہوں نے ماضی کی شاندار روایات کا چراغ روشن رکھا اور ابنائے وطن میں خود اعتمادی و یقین کا اجالا پھیلاتے رہے۔ انہوں نے صحافت کو علم و ادب، داستان و حکایت، عبرت و موعظت اور حق گوئی و بیباکی کا ترجمان بنا دیا۔ انہوں نے مدلل انداز سے جھوٹی خبروں اور افواہوں کا توڑ کیا اور بے خوفی سے حق بات کہتے رہے۔ چیخ پکار اور واویلا مچانے کے بجائے سخت سے سخت بات کا متانت اور خوش طبعی سے جواب دیا۔

اس عہد میں اردو صحافت کی زبوں حالی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ ادیبوں دانشوروں اور مفکروں کی سرپرستی سے محروم ہو گئی۔ آزادی کے بعد بیشتر ادیبوں اور قلمکاروں نے اردو صحافت کو قابل اعتنا نہ سمجھا بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ اسے غیر ادبی مشغلہ سمجھنے لگے۔ بہت سے لوگوں کی سرگرمیاں کچھ اکیڈمیوں اور دانش گاہوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اردو زبان کی تعلیم و تدریس کا نظام درہم برہم ہو جانے کے سبب اردو جاننے اور لکھنے پڑھنے والوں کا حلقہ سمٹنے لگا۔ کچھ لوگوں نے اردو رسم الخط کو بدلنے کی پرزور حمایت شروع کر دی۔ لیکن ان

نامساعد حالات کے باوجود آزادی کے بعد اردو اخبارات ورسائل نے زبان وادب کا رشتہ عوام سے ٹوٹنے نہیں دیا۔ دانش گاہوں کے بجائے عوامی چائے خانوں میں اردو فروغ پاتی رہی اور اردو اخبارات نے اپنی عام فہم زبان اور عوامی لب ولہجہ کیوجہ سے اردو کو مقبول عوام بنائے رکھا۔ یہ شکایت ایک حد تک بجا ہے کہ اردو صحافت کا ادبی و علمی معیار آزادی کے بعد اس طرح پر برقرار نہ رہا جس پر آزادی سے پہلے تھا لیکن اس کے قصوروار خود اردو کے وہ معزز اہل ہیں جنہوں نے صحافت کو دوئم درجہ کی چیز سمجھ کر کنارے ڈال دیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ خالص ادبی مشاغل میں منہمک اہل قلم کا عوام سے رشتہ منقطع ہو گیا۔ ادب اور صحافت کی روٹی کی ذمہ دار ...... کچھ ہمارے مالکان و مدیران اخبارات کی سہل انگاری ہے جنہوں نے اردو کے معتبر اہل قلم سے ربط قائم رکھنے میں کوتاہی برتی۔

آزادی کے بعد اردو صحافت کے لب ولہجہ اور زبان میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ قومی آواز لکھنؤ نے ایک جدید صحافتی زبان کی داغ بیل ڈالی۔ سہیل وحید کے الفاظ میں :

> "وہ اردو استعمال کی جس کو نئی اردو کہا جاسکتا ہے۔ زیادہ اخبارات نے قومی کی وضع کی ہوئی اصطلاحات استعمال کیں اور جملوں کے کنسٹر کشن کو اس یطرز پر کھڑا کیا جس کی نشاندہی قومی آواز نے کی تھی۔" (۱)

قومی آواز نے انگریزی الفاظ اور عربی و فارسی تراکیب کو سہل بنا کر استعمال کیا ہے۔ لیکن کچھ اخبارات قومی آواز کی اتباع میں توازن پر قائم نہ رہ سکے اور عجیب عجیب لفظ استعمال کرنے لگے۔ بلکہ اس معاملہ میں حد سے تجاوز کر گئے۔ لفظوں کے دروبست اور اتار چڑھاؤ کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح الفاظ کے آہنگ اور روانی پر بھی توجہ

---

(۱) صحافتی زبان۔ سہیل وحید، دہلی ۱۹۹۶ء ص ۲۱۱

نہیں دی گئی۔ ہندی کے الفاظ کے استعمال میں بھی قومی آواز نے یہ صحت مند روایت قائم کی کہ اگر ان کا انگریزی متبادل موجود ہے تو اسے اختیار کیا اور جو ہندی الفاظ اردو کی ساخت سے قریب تر ہیں صرف ان کو لے لیا۔ قومی آواز نے املا کے سلسلہ میں بھی کچھ اصلاحات کیں مگر وہ مقبول نہ ہو سکیں لیکن زبان کی سطح پر اس کی تبدیلیاں تسلیم کی گئیں۔

ملک کے دیگر حصوں سے شائع ہونے والے اخبارات کی زبان اور لب و لہجہ میں ان کے علاقوں کے مقامی لب و لہجہ اور لسانی انفرادیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ بمبئی کے روزنامہ انقلاب اور اردو ٹائمس، حیدر آباد کے سیاست ور ہنمائے دکن اور منصف، کانپور کے سیاست جدید، بنگلور کے سالار نے اپنی اپنی علاقائی انفرادیت کو بر قرار رکھا۔ ان کے یہاں قدامت کا تسلسل بھی ہے اور جدید لب و لہجہ کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ ان اخبارات (سیاست، سالار اور انقلاب) نے بقول سہیل وحید :

”جدید لب و لہجہ اختیار کیا اور مکمل اخبار پیش کرنے کی کوشش کی جس میں ایک حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے۔“ (۱)

بمبئی کے انقلاب میں ملک کے بڑے بڑے قلم کاروں اور صحافیوں نے لکھا اور اس کی صحافت کا ادبی معیار خاصا بلند و معتبر رہا ہے۔ حیدر آباد کے روزناموں نے دکنی لب و لہجہ کی انفرادیت اور تہذیبی انفرادیت کی نگہداشت کی اور اپنی مخصوص روایت پر بر قرار رہے۔ بعض اوقات انہوں نے جدید صحافت کے اصول و ضوابط کی بالکل پرواہ نہیں کی۔ چنانچہ دکن کے عوام میں ان کی پذیرائی بر قرار رہی۔ کلکتہ کے آزاد ہند، اخبار مشرق وغیرہ لکھنؤ کے قومی آواز کا تتبع کیا اور انگریزی و اردو کے الفاظ اور جملے بھی اسی کے طرز پر لکھنے کی کوشش کی۔

---

(۱) صحافتی زبان۔ سہیل وحید، دہلی ۱۹۹۶ء ص ۲۱۲

غرض جام جہاں نما سے اپنا سفر شروع کر کے اردو صحافت ۱۹۸۰ء تک آتے آتے خاصی پختہ کار، خاصی رواں دواں، عوام پسند اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اس نے ہندوستان کی علاقائی زبانوں اور انگریزی زبان کے ان اخبارات سے ٹکر لی جو وسائل سے مالامال اور حکومت و سماج کی سرپرست سے مستحکم تھے۔ اردو صحافت نے اپنے بے پناہ محدود وسائل کے باوجود جدید صحافت کی دوڑ میں خود کو شامل رکھا اور جہاں تک ذہن و فکر کو بدلنے اور ملک و معاشرہ کو نیا رخ اور نیا رحجان عطا کرنے کا سوال ہے اس معاملہ میں شاید اس نے دیگر زبانوں کے اخبارات سے زیادہ انقلاب آفریں رول ادا کیا۔ اردو صحافت نے فارسی و عربی کی رنگین اور ثقیل نیر کے آغوش میں جنم لیا تھا لیکن اس نے ڈیڑھ سو سال کے سفر میں جدید ترین اسالیب ایجاد و اختیار کئے جو اس صنعتی و تکنیکی دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔ اس نے اب انفارمیشن ٹکنالوجی کے حشر خیز ارتقا کا بھی ساتھ دینے کی کوشش کی ہے۔ اب غیر ضروری عبارت آرائی اور الفاظ کے گورکھ دھندے کے بجائے اختصار اور راست گفتاری کا طرز عمل اپنایا گیا ہے تا کہ بات جلد از جلد سمجھائی جا سکے اور خیالات کی جلد از جلد ترسیل ممکن ہو سکے۔

اس جائزہ کا ماحصل یہ ہے کہ اردو نثر کے صحت مند اور توانا اسالیب کے فروغ میں اردو نے ہر دور میں ایک مثبت کردار ادا کیا ہے اور آج اردو نثر کو اسنے بین الاقوامی سطح پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ ہر آن بدلتی ہوئی اور لمحہ بہ لمحہ متغیر دنیا کے احوال و افکار کی ترسیل اور ابلاغ میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی نثر کے اسالیب سے کسی طرح پیچھے نہیں۔

کتابیات

۱	اردو کے اسالیب بیان	محی الدین قادری زور	مکتبہ معین الادب، لاہور	۱۹۶۴ء
۲	اردو ساخت کے بنیادی عناصر	نصیر احمد خاں	اردو محل پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۹۱ء
۳	اردو ہندی کا لسانی رشتہ	رام آسرے راز	راز اینڈ سنسز، دہلی	۱۹۷۵ء
۴	اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل بیگ	......	۱۹۸۶ء
۵	اسلوبیاتی مطالعہ	منظر عباس نقوی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علیگڈھ	۱۹۸۹ء
۶	اردو طباعت واشاعت کے مسائل	انور کمال حسینی	......	
۷	اردو صحافت	مرتبہ انور علی دہلوی	دہلی اردو اکیڈمی، دہلی	۱۹۸۷ء
۸	اردو صحافت کا استغاثہ	پروانہ ردولوی	حیا پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۱۹۹۴ء
۹	اردو معلیٰ	حسرت موہانی		
۱۰	اخبار جمہور	پروفیسر عابدہ سمیع الدین	دریا گنج دہلی	۱۹۹۵ء
۱۱	اردو صحافت پر ایک نظر	گربچن چندن	دہلی اردو اکیڈمی، دہلی	۱۹۸۶ء
۱۲	اسلامی صحافت	سید عبید اسلام ذہنی	مرکز مکتبہ اسلامی، لاہور	۱۹۹۰ء
۱۳	اداریہ نویسی	مسکین علی حجازی	مرکزی اردو بورڈ، لاہور	۱۹۷۰ء
۱۴	ابلاغیات	مرتبہ طاہر مسعود	ادارہ ابلاغیات، کراچی	۱۹۸۶ء
۱۵	اردو کے اخبار نویس	امداد صابری	صابر اکیڈمی چوڑی والان دہلی	۱۹۷۳ء
۱۶	اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ	ایس-ایم-ناز	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۸ء

۱۷ اردو ادب پر ذرائع ترسیل عامہ کے اثرات	قیصر شمیم	ڈاکٹر محمد رضوان الحق، دہلی	۱۹۸۹ء
۱۸ اردو صحافت کی تاریخ	نادر علی خاں	ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڈھ	۱۹۸۷ء
۱۹ اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل	مرتبہ عابد سہیل	اردو اکیڈمی اتر پردیش لکھنؤ	۱۹۸۸ء
۲۰ اخبار کی کہانی	غلام حیدر	ترقی رفع بیورو، دہلی	۱۹۸۰ء
۲۱ البلاغ کلکتہ	مولانا ابوالکلام آزاد		
۲۲ الہلال	مولانا ابوالکلام آزاد	اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ	۱۹۸۴ء
۲۳ انتخاب اردوئے معلیٰ	مرتبہ حسرت موہانی	اردو پریس، علی گڈھ	
۲۴ اودھ پنچ کی ادبی خدمات	محمد عبدالرزاق فاروقی	شاہین کلب کرنول آندھرا پردیش	۱۹۸۲
۲۵ آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ	
۲۶ آزادی کے بعد ہندوستا میں اردو ادب	مرتبہ عتیق صدیقی	مکتبہ شاہ راہ اردو بازار، دہلی	۱۹۶۶ء
۲۷ پاکستان وہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ	ڈاکٹر مسکین علی حجازی	سنگ میل کیشنز، لاہور	۱۹۸۹ء
۲۸ تہذیب الاخلاق	سر سید احمد خاں	ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۷۴ء
۲۹ ترسیل عامہ	ترجمہ: عرفان صدیقی	نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی	۱۹۸۱ء
۳۰ تاریخ صحافت اردو جلد اول	امداد صابری		
۳۱ تاریخ صحافت اردو جلد دوم	امداد صابری		۱۹۶۳ء
۳۲ تاریخ صحافت اردو جلد سوم	امداد صابری	شاہ اسرالحق کوٹہ	۱۹۶۵ء
۳۳ تاریخ صحافت اردو جلد پنجم	امداد صابری	اکرم قادری، دہلی	۱۹۸۳ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سال
۳۴	جدید اردو لسانیات	ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین	شعبۂ اردو میرٹھ یونیورسٹی	۱۹۸۲ء
۳۵	جنوبی ہند کی اردو صحافت	ڈاکٹر محمد فضل الدین اقبال		
۳۶	جنوبی ہند کی اردو صحافت	سید صفی اللہ	مقالہ برائے ایم-اے	
۳۷	حیدر آباد میں اردو صحافت	طیب انصاری	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد	۱۹۸۰ء
۳۸	خبر نگاری	شافع قدوائی	نصرت پبلشرز امین آباد، لکھنؤ	۱۹۸۸ء
۳۹	دکنی نثر کا انتخاب	ڈاکٹر سیدہ جعفر	ترقی اردو بیورو، دہلی	۱۹۸۳ء
۴۰	دہلی اردو اخبار	مرتبہ مع مقدمہ خواجہ احمد فاروقی	شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی	۱۹۷۴ء
۴۱	روح صحافت	امداد صابری	مکتبہ شاہراہ، دہلی	۱۹۶۸ء
۴۲	سرسید کی صحافت	اصغر عباس	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	۱۹۷۵ء
۴۳	رہبر اخبار نویسی	سید اقبال قادری	ترقی اردو بیورو، دہلی	۱۹۸۹ء
۴۴	صحت زبان	جگر بریلوی		
۴۵	صحافتی زبان	مسکین علی حجازی	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۷۵ء
۴۶	صحافت پاکستان و ہند میں	عبدالسلام خورشید	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۳ء
۴۷	عوامی ذرائع ترسیل	اشفاق محمد خاں	مصنف	۱۹۸۹ء
۴۸	غبار خاطر	مرتبہ مالک رام	ساہتیہ اکیڈمی، دہلی	۱۹۶۷ء
۴۹	فن ادارات	مسکین علی حجازی	مرکزی اردو بورڈ، لاہور	
۵۰	فن صحافت	چودھری رحم علی الہاشمی	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	۱۹۴۳ء

۵۱ فیچر نگاری — شفیق جالندھری — علمی کتاب خانہ، لاہور — ۱۹۸۳ء

۵۲ فن ادارت — مسکین علی حجازی — مرکزی اردو بورڈ، لاہور — ۱۹۷۶ء

۵۳ کاروان صحافت — عبدالسلام خورشید — انجمن ترقی اردو کراچی — ۱۹۸۹ء

۵۴ گلدستہ صحافت — ظ-انصاری — بزم ادب کامٹی — ۱۹۸۷ء

۵۵ لسانیات کیا ہے — ڈیوڈ کرسٹل ترجمہ نصیر احمد خاں — ترقی اردو بیورو، دہلی — ۱۹۸۸ء

۵۶ لسانی مطالعے — ڈاکٹر گیان چند — ترقی اردو بیورو، دہلی — ۱۹۷۳ء

۵۷ لکھنؤ کی لسانی خدمات — ڈاکٹر حمید الدین ندوی

۵۸ مولانا ابوالکلام آزاد — رشید الدین خاں — ترقی اردو بیورو، دہلی — ۱۹۸۹ء

۵۹ مولانا آزاد کا نظریہ صحافت — قطب اللہ — اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ

۶۰ مبادیات اخبار نویسی — فرخندہ ہاشمی — ملک بک ڈپو، لاہور — ۱۹۸۷ء

۶۱ محسن صحافت — اقبال زبیری — ادارہ مشرف، لاہور — ۱۹۷۶ء

۶۲ مدھیہ پردیش میں اردو صحافت — مرتبہ : اشتیاق عارف

۶۳ نقوش صحافت — رشید تاثیر — محافظ پبلی کیشنز، سری نگر — ۱۹۸۹ء

۶۴ نیرنگ خیال — محمد حسین آزاد

۶۵ ہندستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) — عتیق صدیقی — انجمن ترقی اردو ہند، علیگڈھ — ۱۹۵۷ء

۶۶ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ — ترجمہ : ابن الحسن احتشام حسین

۶۷ اردو صحافت کا استغاثہ — پروانہ ردولوی — حیا پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی — ۱۹۹۶ء

हिन्दी किताबें

क्रमां	किताब का शीर्षक	लेखक का नाम	प्रकाशक	वर्ष
१	हिन्दी पत्रकारिता,	डा० वेद प्रताप वैदिक	हिन्दी बुक सेन्टर दिल्ली	१९९२
२	भाषा और समाज	डा० राम विलास शर्मा	राजकमल प्रकाशन दिल्ली	१९८६
३	संचार और विकास	श्यामा चरण दुबे	प्रकाशन विभाग भारत सरकार नई दिल्ली	१९८०

ENGLISH BOOK

Sl.	Title	Author	Publisher	Year
1	Professional Journalism	M.V. Kamath	Print Hall of India, Delhi	1980
2	Modern Journalism	G. Miller	- -	1980
3	History of Indian Journalism	J. Natrajan	Dimension Publication Delhi	1955
4	Journalism in India	Ramaswamy Parthsarthy	Sterling Publication Delhi	1981
5	Mass Media & the national experiences	Ronald t. Farner & J. Stevenson	Harper Publishers Delhi	1981
6	Reflection on languages	Noam Chowmesky	- -	1981

رسائل

۱	آج کل صحافت نمبر	مدیر راج نرائن راز	پبلی کیشنز ڈویژن، دہلی	نومبر دسمبر ۱۹۸۳ء
۲	آج کل صحافت نمبر حصہ دوم	مدیر برج نرائن راز	پبلی کیشنز ڈویژن، دہلی	جنوری ۱۹۸۵ء
۳	انشاءاحمد سعید ملیح آبادی نمبر	مدیر ف-س-اعجاز	کلکتہ	۱۹۸۷ء
۴	معلم اردو حیات اللہ انصاری نمبر حصہ ۱-۲	مدیر اظہار احمد	لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۵	اکاڈمی	......	اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ	......